قرآن وسنت اور اسلاف امت کی تعلیمات کا داعی
دینی، علمی، ادبی، تحقیقی اور اصلاحی مضامین کا حامل

مجلّہ صدائے حق بنگلور

سرپرست

حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری زیدت معالیھم

استاذ حدیث ومدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

مدیر

عبدالرزاق بنگلوری

نائب مدیر

مفتی عبدالرحمٰن بنگلوری

ناشر

مجلس، صدائے حق اسلامک پورٹل بنگلور-78

قرآن وسنت اور اسلافِ امت کی تعلیمات کا داعی

دینی، علمی، ادبی، تحقیقی اور اصلاحی مضامین کا حامل

مجلّہ

صدائے حق بنگلور

جلد:۰۳	شمارہ:۷	ماہ جنوری ۲۰۲۲ء	ماہ جمادی الثانی ۱۴۴۳ھ

سرپرست

حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری دامت برکاتہم

استاذِ حدیث و مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

مدیر	نائب مدیر
عبدالرزاق بنگلوری	مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری

مجلس ادارت

- مفتی محمد علی صاحب قاسمی
- مولانا محمد اُویس صاحب رشادی
- مولانا عبداللطیف صاحب قاسمی

مجلسِ مشاورت

- مولانا اشرف صاحب قاسمی
- مولانا عبدالقدوس صاحب مظاہری
- مفتی عبدالفتاح صاحب قاسمی

ADVERTISEMENT TARIFF

Full Page (Title Back Cover)	6000/-
Full Page (Title Inner Cover)	5000/-

Black and White

Full Page (Inside Pages)	2000/-
Half Page (Inside Pages)	1000/-
Cuarter Page (Inside Pages)	500/-

Phone Pe & Google Pay:7406464533

مضمون نگار کی آرا سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

شائع کردہ

مجلس: صدائے حق اسلامک پورٹل بنگلور 78

فہرست مضامین

عناوین	مضامین	اسمائے محررین	صفحہ نمبر
اداریہ	دَورِ موجود میں سوشل میڈیا کا استعمال ''صحیح یا غلط''	عبدالرزاق بنگلوری	۳
توحید	تیری رحمت کے اِک اشارے پر	مولانا عمرین محفوظ رحمانی صاحب	۶
درسِ حدیث	گناہوں کے معاملہ میں مؤمن و بدکار کا حال	مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری	۸
تحفظ ختم نبوت	خود میرے نبی نے یہ بات بتادی ''لَانَبِيَّ بَعْدِيْ''	مولانا جواد احمد خان صاحب رشادی	۱۴
تذکرۂ صحابہؓ	سیرت سیدنا عمر فاروقؓ (قسطِ اول)	مفتی محمد عمران صاحب شاہی وقاسمی	۱۷
اصلاحِ معاشرہ	دینی خدمت گزاروں کے معاش کا مسئلہ	مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی	۲۱
// // //	پڑوسیوں کے حقوق (قسط دوم)	مفتی محمد عفان صاحب منصور پوری	۲۵
// // //	تصنیف وتالیف کی اہمیت	مولانا محمد اویس صاحب رشادی	۳۱
// // //	کیا نصوح کی توبہ کا واقعہ صحیح ہے (قسط اوّل)	مفتی احمد اللہ نثار صاحب قاسمی	۳۸
// // //	منکراتِ رجب جدید (قسط اوّل)	مفتی عبداللطیف صاحب قاسمی	۳۷

اطلاعِ عام

نوٹ: مضمون نگار اپنے مضامین مندرجہ ذیل ای میل (E-mail) یا واٹسیپ (WhatsApp) پر ان پیج (InPage) فائل روانہ کرسکتے ہیں، جزاکم اللّٰہ خیراً وأحسن الجزاء.

Email: muftiabdurrahman57@gmail.com
Whatsapp No: 09620795460 - 9739349433

اداریہ

دَورِ موجود میں سوشل میڈیا کا استعمال ''صحیح یا غلط''

از: عبدالرزاق بنگلوری

موجودہ دَور میں ملکی وغیر ملکی حالات سے باخبر رہنا اور اپنے خیالات کا اظہار کرنا اتنا مشکل نہیں؛ کیونکہ سوشل میڈیا نے پوری دنیا کو سمیٹ کر ہمارے ہاتھ میں دیدیا ہے۔

سوشل میڈیا کے نقصانات کی فہرست بہ نسبت اس کے فوائد کے زیادہ ہے۔ نوجوانوں میں فحاشی وعریانی پھیلانا اسلام دشمن قوتوں کا مقصد ہے۔ ان کے اس مقصد کی تکمیل کے لیے سوشل میڈیا ایک اہم ہتھیار ثابت ہورہا ہے، دُور بیٹھے احباب سے رابطہ تو آسان بن چکا ہے؛ لیکن قریبی تعلقات دُور ہوتے چلے گئے ہیں، بِنا سوچے سمجھے تصاویر وغیرہ شیئر کرنے کے کئی نقصانات سامنے آچکے ہیں، بے مقصد شہرت اور زیادہ لائیکس حاصل کرنے کے چکر میں اسلامی واخلاقی اقدار کو روندا جاتا ہے، نازیبا تصاویر اور ویڈیوز شیئر کرکے کئی گناہوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے، بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ کلچر بھی سوشل میڈیا کی رہینِ منت ہے، یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ سوشل میڈیا کی بدولت خودکشی کو فروغ ملا ہے، ایک سروے کے مطابق سوشل میڈیا پر ایک رپورٹ شیئر کی گئی کہ ہائڈروجن سلفائڈ کے ذریعے بآسانی خودکشی کی جاسکتی ہے، تھوڑے ہی عرصے بعد ۲۲۰/لوگوں نے اس طریقے سے خودکو مارنے کی کوشش کی جن میں سے ۲۰۸/کامیاب بھی ہوئے۔

اس کے علاوہ جھوٹی خبروں کی تشہیر، دھوکا دہی، جعلی اکاؤنٹس، ہیکنگ اور بلیک میلنگ کے بڑھتے ہوئے واقعات میں سوشل میڈیا کا بنیادی کردار ہے۔ عصر حاضر کے اکثر نوجوانوں کا کاہل، سست، تن آسان اور ذہنی وفکری طور پر پست ہونا سوشل میڈیا کے نشے کی وجہ سے ہے۔ دراصل سوشل میڈیا خود ایک اچھا یا بُرا پلیٹ فارم نہیں ہے؛ بلکہ یہ استعمال کرنے والوں کے اُوپر ہے کہ وہ اس کو کس طرح استعمال کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل وشعور جیسی عظیم نعمت صحیح اور غلط میں فرق کرنے کے لیے دی ہے۔

سوشل میڈیا فی نفسہٖ قبیح نہیں ہے:

سوشل میڈیا فی نفسہٖ غلط اور قبیح نہیں ہے؛ البتہ اغیار نے اس کو قبیح بنادیا ہے، اس کے ذریعے مختلف ملکوں اور

قوموں کی تہذیب وثقافت سے واقفیت بھی حاصل کی جاسکتی ہے، اپنی رائے کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی آواز اعلیٰ عہدیداران تک بھی پہنچائی جاسکتی ہے۔

واٹس اَپ پر کورسز کا ٹرینڈ نہایت تیزی کے ساتھ مقبول ہورہا ہے، جس کے ذریعے آپ نہ صرف گھر بیٹھے تعلیم حاصل کرسکتے ہیں؛ بلکہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے گھر بیٹھے پیسے بھی کما سکتے ہیں۔ مفتیانِ کرام سے فتویٰ لینے کے ساتھ ساتھ بیرونِ ملک بیٹھے ڈاکٹرز کی خدمات بھی حاصل کی جاسکتی ہیں، اسکائپ ودیگر ویڈیو کال سافٹ ویئرز کی بدولت قرآنِ کریم کی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ مختلف کورسز بھی کیے جاسکتے ہیں۔ سوشل میڈیا کا مثبت استعمال کرتے ہوئے ملک واسلام دشمنوں کی سازشوں کو روکا جاسکتا ہے، ملحدین ودیگر اسلام بیزار لوگوں کے خلاف سوشل میڈیا پر بہترین انداز میں کام ہورہا ہے۔ اسلامی، سیاسی، سماجی ودیگر حلقوں سے تعلق رکھنے والے احباب اپنے نظریات کا بخوبی پرچار کررہے ہیں۔ کاروبار کی تشہیر کرنا، نوکری تلاش کرنا، ادب کو فروغ دینا یا کسی غریب کی مدد کرنا سوشل میڈیا کی بدولت آسان بن چکا ہے۔

سوشل میڈیا کا صحیح استعمال:

جہاں ان ایجادات کے بہت سے فوائد ہیں وہاں ان کے نقصانات بھی ہیں، تاہم ان ایجادات کے درست استعمال سے ہم نہ صرف اپنے کاموں میں آسانی پیدا کرسکتے ہیں؛ بلکہ ان ایجادات کے ذریعے دینی، اخلاقی اور معاشرتی بہتری کے لیے مفید خدمات بھی سرانجام دے سکتے ہیں۔ سول میڈیا پر قرآن کی آیتیں، قرآن کا بیان یا کوئی دینی بات جو مستند طور پر آپ کو معلوم ہو وہ دوسرے کو بھیج سکتے ہیں؛ لیکن اس بھیجنے کا کوئی نیک مقصد ہونا چاہیے، صرف کھیل اور تفریح مقصود نہ ہو؛ نیز حدیث مستند ہو، آیتوں کا ترجمہ کسی معتبر اور معتمد عالم کا کیا ہوا ہو، اسی طرح دین کی بات بھی معتبر طریقہ سے آپ کو معلوم ہوئی ہو تو اسے آگے شیئر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اس وقت اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ سوشل میڈیا کا اچھے مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے اس کی مضرتوں سے نئی نسل کو بچایا جائے؛ کیوں کہ جن چیزوں میں نفع اور نقصان دونوں پہلو ہوں اور اس ذریعے کو بالکل ختم کردینا ممکن نہ ہو تو اسلامی نقطۂ نظر سے اس کو مفید طریقے پر استعمال کرنا اور اس کے نقصان دہ پہلو سے بچنا ضروری ہے۔ مثلاً جس چاقو سے کسی جانور کو حلال طریقے پر ذبح کیا جاسکتا ہے اور کسی بیمار کو نشتر لگایا جاسکتا ہے، وہی چاقو کسی بے قصور کے سینے میں پیوست بھی کیا جاسکتا ہے، تو ہمارے لیے یہاں یہ راستہ ہے کہ ہم چاقوں کے صحیح استعمال کی تربیت حاصل کریں؛ لہٰذا ہم سوشل میڈیا کے ذریعے مختلف ایسے پروگرامز کا انعقاد کریں جو عوام الناس کے لیے نفع بخش ہو، جس سے عوام وخواص رہنمائی حاصل کرسکے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا

ارشاد ہے: ''حکمت کی بات بندۂ مؤمن کی گمشدہ متاع ہے، اسے جہاں پاتا ہے اٹھالیتا ہے''۔ (السنن الترمذی: ج۵/ص۵۱) سوشل میڈیا بُرائی اور اچھائی کا مشترکہ مجموعہ ہے؛ لہٰذا اس کا استعمال احتیاط سے کرنا ہماری ذمہ داری ہے، یہ فیصلہ اب ہمارے اُوپر منحصر ہے کہ آیا اس کے مثبت استعمال سے دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت بھی سنوار لیں یا دونوں جہانوں کی ناکامی اپنے سر لے لیں۔ سائنس کے اس ترقی کے دَور میں سب سے معاشرے کی اصلاح کا کام لیا جاسکتا ہے۔

ضرورت اِس امر کی ہے کہ ہر مسلمان اپنی ذمہ داری کا احساس کرے، میڈیا کی سب سے بڑی ذمہ داری معاشرے کی ترقی اور اصلاح ہے اور معاشرتی اور انسانی اقدار کا تحفظ اور ان کا شعور دینا بھی میڈیا کی ذمہ داری ہے۔ مسلم معاشرے میں جو ذمہ داری ایک فرد کی ہے وہ اجتماعی صورت میں میڈیا کی ہے؛ لہٰذا میڈیا کا کردار غیر جانبدارانہ اور مصلحانہ ہونا چاہیے۔ اس کے کردار میں معلمانہ اور منصفانہ پہلو غالب ہونا چاہیے، حق شناسی اس کا شعار اور باطل شکنی اس کی پہچان ہونی چاہیے؛ لیکن اس کے برعکس آج الکٹرانک میڈیا ہو یا پرنٹ میڈیا یا سوشل میڈیا ہر ایک اسلام اور مسلمانوں کی غلط تصویر دنیا کے سامنے پیش کرنے میں اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ مصروفِ عمل ہے، خصوصاً ہمارے ملک میں میڈیا کا کردار مسلمانوں کے منفی پہلو کو اُجاگر کرنے میں دن رات مصروف ہے؛ اِس لیے ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم اس کو معاشرے کو سنوارنے اور اسے صالح بنانے میں استعمال کریں، خاص طور پر میڈیا نے نوجوان نسل کو سب سے زیادہ اپنی طرف مائل کیا ہے؛ اِس لیے نوجوانوں کی سوچ اور نفسیات کو سمجھنے کے لیے اس کا مثبت استعمال بہت ضروری ہے، ہمارے نوجوانوں میں بے پناہ قدرتی صلاحیت موجود ہے؛ لہٰذا سوشل میڈیا کو موثر انداز میں نوجوانوں کی رہنمائی کے لیے استعمال کرنے کے لیے ہر ممکن اقدام کرنے چاہئیں، سوشل میڈیا کے مثبت استعمال سے نوجوانوں کی زندگی میں غیر معمولی انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے۔ آج میڈیا فحاشی وعریانی کے کلچر کو فروغ دے رہی ہے، جس کی وجہ سے ہماری نوجوان نسل تباہ وبرباد ہورہی ہے، ہماری نوجوان نسل کو مغربی کلچر، فلموں اور ان کے اداکاروں کے بارے میں پوری معلومات ہیں؛ مگر انھیں اپنی روایات، مذہب اور تہذیبی اقدار کے بارے میں علم نہیں ہے؛ اِس لیے ہماری بالخصوص علماءِ کرام کی ذمہ داری ہے کہ ہم خود بھی اس کا صحیح استعمال کریں اور اس کے ساتھ ساتھ سوشل میڈیا کے ذریعے دینی، ملی اور مذہبی خدمات کے ذریعے اپنے نوجوان نسل کی حفاظت کریں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح سمجھ اور سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

❑❖❑

توحید

تیری رحمت کے اِک اشارے پر

ازقلم: مولانا محمد عمرین محفوظ رحمانی صاحب، سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

اللہ پاک رحمان ورحیم ہے اور قرآنِ پاک بار بار اللہ پاک کی جن خوبیوں اور صفات کو بیان کرتا ہے، اُن میں سب سے نمایاں صفت اس کی رحمت ہے، جس کی وجہ سے وہ دنیا کے انسانوں کی تمام ضرورتیں پوری کرتا ہے، انسان کی ضروریات دو طرح کی ہیں: مادی ضروریات؛ جن میں کھانا پینا اور اسبابِ زندگی شامل ہیں اور روحانی ضروریات؛ جن میں ہدایت کے لیے قرآنِ پاک کا نزول اور حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک وجود شامل ہے۔ اللہ پاک نے انسان کی مادی وجسمانی اور معنوی وروحانی صروریات کی تکمیل کے لیے تمام ضروری چیزیں پیدا فرمائی ہیں یہ اس کی صفتِ رحمت کا نتیجہ ہے۔ اللہ پاک اپنے بندوں سے بہت زیادہ محبت کرنے والا اور ان پر رحم کرنے والا ہے، قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر اللہ پاک نے خود اس بات کا اظہار فرمایا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے: ''اے پیغمبر! میرے بندوں کو بتادو کہ میں بہت زیادہ بخشنے والا اور بے حد رحم کرنے والا ہوں''، دوسری جگہ ارشاد ہے: ''میری رحمت ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے''، تیسری جگہ ارشاد ہے: ''رحمت کو اللہ پاک نے اپنے اُوپر لازم کرلیا ہے''۔

ایک جنگ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاتون کو دیکھا جس کا بچہ اس سے بچھڑ گیا تھا اور وہ اپنے بچے کی تلاش میں پریشان اور بے قرار لوگوں کے درمیان دوڑتی بھاگتی پھر رہی تھی، یہاں تک کہ کوئی بچہ اسے نظر آتا تو اسے اپنا بچہ سمجھ کر سینے سے چمٹا لیتی اور پھر اپنے بچے کی تلاش میں آگے بڑھ جاتی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے کہ کیا یہ ماں اپنے بچے کو آگ میں ڈالنا گوارا کرے گی؟ صحابہؓ نے جواب دیا ہرگز نہیں! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس ماں کو اپنے بچے سے جتنی محبت ہے اور وہ اپنے بچے پر جتنا رحم کرنے والی ہے، اللہ اپنے بندوں اور بندیوں سے اس سے کہیں زیادہ محبت اور ان پر رحم کرنے والا ہے۔

دنیا میں اللہ پاک کی رحمت تمام انسانوں کے لیے عام ہے اور اس کی نعمتیں تمام انسانوں کے لیے عام ہیں، جیسے سورج سب کے لیے نکلتا ہے اور پانی ہر ایک کے لیے برستا ہے؛ لیکن آخرت میں خدا کی رحمت کے حقدار وہی لوگ ہوں گے جو ایمان والے ہیں، شرک اور کفر کرنے والے اس کی رحمت سے محروم ہوجائیں گے؛ چنانچہ اللہ پاک معمولی معمولی بہانے سے ایمان والے بڑے بڑے گنہگاروں کو معاف فرمادے گا، آج ہم اس کا تصور نہیں کرسکتے۔

اسی طرح یہ بھی نہیں جانتے کہ اپنی غلطی اور گناہوں کی وجہ سے کون انسان خدا کے یہاں پکڑا جائے گا؛ اِس لیے کوئی انسان اللہ کی رحمت سے مایوس بھی نہ ہو اور اس کی پکڑ سے بے خوف ہو کر گناہوں پر جرأت بھی نہ کرے۔

ہم لوگ اگر اللہ پاک کی رحمت کے طلب گار ہیں تو ہمیں ان اعمال کو اختیار کرنا ہوگا جن کی وجہ سے ہم اللہ پاک کی رحمت حاصل کر سکتے ہیں، قرآنِ کریم میں ہے کہ اہلِ ایمان ایک دوسرے کے مددگار ہیں، وہ ایک دوسرے کو اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بُری باتوں سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اُس کے رسول کی فرماں برداری کرتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ اپنی رحمت نازل فرمائے گا۔

معلوم ہوا کہ امر بالمعروف، نہی عن المنکر، نمازوں کا اہتمام، زکوٰۃ کی ادائیگی اور اللہ واللہ کے رسول کی اطاعت، یہ وہ اعمال ہیں جو اللہ کی رحمت کو قریب کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ انسان غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے، رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرے اور کمزوروں کی مدد کرے تو اس کے ذریعہ بھی وہ اللہ کی رحمت کا مستحق ہوگا، حدیث شریف میں ہے کہ تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔ مسلم شریف کی روایت ہے کہ جب تک بندہ اپنے بھائی کا مددگار رہو، اللہ اُس کا مددگار ہے۔ اسی کے ساتھ دعا کے ذریعہ بھی اللہ سے اس کی رحمت کا سوال کرنا چاہیے کہ وہ ہمیں اپنی رحمت سے مالا مال فرمائے۔

آج ہمیں اللہ کی رحمت سے محرومی کا سامنا اِس لیے ہے کہ ہم ان اعمال کی اَنجام دہی میں کوتاہی کر رہے ہیں جو خدا کی رحمت کو قریب کرنے کا ذریعہ ہیں، اسی کے ساتھ ہم نے دعا کے ذریعہ خدا کی رحمت کا سوال کرنا بھی چھوڑ دیا، جس کی وجہ سے مشکلات اور پریشانیوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے، ایسے حالات میں ہمیں اللہ پاک سے اس کی رحمت کا سوال کرنا چاہیے اور نیک اعمال کی اَنجام دہی میں آگے بڑھنا چاہیے۔ ؎

تیری رحمت کے اِک اشارے پر
لے کے آئے بھنور کنارے پر
لائقِ بندگی صرف تِری ہستی
جھکنا لازم ترے دُوارے پر
تِری رحمت ہے بس مِری اُمید
لطف و کرم ہو غم کے مارے پر

❑❖❑

درسِ حدیث

گناہوں کے معاملہ میں مؤمن و بدکار کا حال!

ازقلم: مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری، ناظم مدرسہ دارالتوحید، اعلیٰ ہلی بنگلور

حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بِحَدِيْثَيْنِ: أَحَدُهُمَا عَنْ نَفْسِهٖ، وَالْآخَرُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ: إِنَّ الْمُؤْمِنَ يَرَى ذُنُوْبَهٗ، كَأَنَّهٗ فِيْ أَصْلِ جَبَلٍ، يَخَافُ أَنْ يَقَعَ عَلَيْهِ، وَإِنَّ الْفَاجِرَ يَرَى ذُنُوْبَهٗ، كَذُبَابٍ وَقَعَ عَلٰى أَنْفِهٖ، قَالَ بِهٖ هٰكَذَا، فَطَارَ. (ترمذي: ج ٢/ ٧٦)

حارث بن سوید کہتے ہیں: ہم سے حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے دو باتیں بیان کیں: ایک اپنی طرف سے اور دوسری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے، پہلی بات: جو موقوف ہے، حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مؤمن اپنے گناہوں کو دیکھتا ہے، گویا وہ کسی پہاڑ کے دامن میں ہے اور ڈر رہا ہے کہ وہ پہاڑ اس پر گر پڑے گا، اور بدکار اپنے گناہوں کو اس مکھی کی طرح دیکھتا ہے جو اس کی ناک پر بیٹھ گئی، پس اس نے اس کو یوں کیا، یعنی ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ اُڑ گئی۔

تشریح:

اس حدیث میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مؤمن کی گناہوں سے تشبیہ دی ہے، وہ کسی طرح کی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے، گناہ کرتے وقت مؤمن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ گویا وہ ایک پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہوا ہو، پتہ نہیں وہ پہاڑ اس پر کب گر جائے اور جس شخص پر پہاڑ گر جائے تو جو شخص اس کے نیچے ہو اس کی نجات (بچنے) کی کوئی شکل باقی نہیں رہتی، ٹھیک اسی طرح مؤمن اللہ کی عظمت اور جلال کی طرف دیکھتے ہوئے، اللہ کی مخلوق سے بے نیازی اور مخلوق تمام کی تمام اس کی محتاج ہے، اسی وجہ سے چھوٹی سے چھوٹی نافرمانی بھی مؤمن کے نزدیک آسان وسہل معاملہ نہیں ہے؛ جس کی وجہ سے گناہ کے وقت ایسا تصور پیدا کرتا ہے گویا وہ کسی پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہو، اس گناہ کے وبال کو ذہن میں رکھتے ہوئے گناہ کرتے وقت یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی پہاڑ کے نیچے ہو۔

اس کے بالمقابل فاسق وفاجر اپنے گناہوں کو بالکل معمولی اور ہلکا سمجھتا ہے، یہاں تک کہ وہ بڑے سے بڑے گناہ کو بھی ہلکا اور معمولی سمجھتا ہے، گویا ناک پر مکھی بیٹھی تھی اس فاسق نے اس کو ہاتھ کے اشارہ سے بھگا دیا اور مکھی چلی گئی، اس مکھی سے نہ اس کو فائدہ ہوا نہ نقصان، یہ نتیجہ ہے ایمان کا رشتہ اللہ کی ذات سے کمزور ہو چکا ہے

جس کے سبب اس کے دل میں گناہ کی ہیبت وخوف نہیں ہے۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا مِنْہُ

پھر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے گناہوں سے توبہ کرنے والے کی طرف اللہ کے متوجہ ہونے کی حدیث نقل فرمائی جو ذیل میں مذکور ہے۔

گناہ گار بندے کی توبہ سے اللہ کی خوشی:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ تم میں سے ہر ایک کی توبہ سے یقیناً زیادہ خوش ہوتے ہیں، اس شخص سے جو کسی مہلک تباہ کن بیابان میں ہو، اس کے ساتھ اس کی سواری ہو، جس پر اس کا توشہ، اس کا کھانا اور اس کا پینا اور وہ چیز ہو جو اسے سنوارے، پس اس نے سواری کو گم کر دیا، پس وہ اس کی طلب میں نکلا، یہاں تک کہ جب اس کو موت آنے لگی تو اس نے کہا: میں اس جگہ کی طرف واپس چلوں جس جگہ میں نے اپنی اُونٹنی کو گم کیا ہے (کیونکہ اُونٹ کی عادت ہے کہ اس کو پہلی مرتبہ جہاں بٹھایا جاتا ہے، وہ گھوم پھر کر وہیں آ کر بیٹھتا ہے؛ اِس لیے اس آدمی نے خیال کیا کہ شاید میری اُونٹنی وہیں آئے اور نہ آئی تو) اس جگہ میں مر جاؤں، پس وہ اپنی جگہ لوٹ آیا، اور اس کی آنکھ لگ گئی، جب وہ بیدار ہوا تو اچانک اس کی سواری اس کے پاس کھڑی ہے، جس پر اس کا کھانا، اس کا پینا اور وہ چیز ہے جو اس کو سنوارتی ہے (اس وقت مسافر کو کتنی خوشی ہوگی؟ اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے! اللہ تعالیٰ کو بندے کی توبہ سے اس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے)۔

تشریح:

غور کیجیے! ایک مسافر اپنی اُونٹنی پر سوار ہو کر، اور اس پر کھانے پینے کا سامان لاد کر، دُور دراز کے سفر پر نکلا، وہ راستہ میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے اُترا، جب سو کر اٹھا تو اُونٹنی غائب تھی اور بیابان بے آب وگیاہ ہے، وہ حیران وسراسیمہ ہو کر اُونٹنی کی تلاش میں دوڑا بھاگا؛ مگر کامیاب نہ ہوا، یہاں تک کہ جب گرمی اور پیاس نے اس کو لبِ دم کر دیا تو اس نے سوچا: شاید میری موت اس بیابان میں مقدر ہے؛ چنانچہ وہ مرنے کے لیے اسی درخت کے سائے میں آ کر پڑ گیا، آنکھ پھر جھپکی اور جب کھلی تو اُونٹنی پورے ساز وسامان کے ساتھ وہاں موجود تھی، اس وقت اس محروم قسمت مسافر کو اپنی اُونٹنی کے مل جانے پر کتنی خوشی ہوگی؟ اسی طرح جب بندہ جرم کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے، اور سچے دل سے توبہ کرتا ہے تو اس مہربان اللہ تعالیٰ کو اس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے، پس گناہ گاروں کو مایوس نہیں ہونا چاہیے، انہیں پہلی فرصت میں اپنے خالق ومالک کی طرف رجوع کرنا چاہیے؛ کیونکہ اس کے لیے اس دروازہ کے علاوہ کوئی دروازہ نہیں۔

کبھی بھی اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہیں ہونا چاہیے:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَاتَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾
(پ:۲٤، سورۃالزمر، رقم الآیۃ:٥٣، رکوع:٦)

کہہ دے اے بندو میرے جنہوں نے کہ زیادتی کی ہے اپنی جان پر! آس مت توڑو اللہ کی مہربانی سے۔ (شیخ الہندؒ)

تشریح:

یہ آیت ارحم الراحمین کی رحمت بے پایاں اورعفو ودرگزر کی شانِ عظیم کا اعلان کرتی ہے اور سخت سے سخت مایوس العلاج مریضوں کے حق میں اکسیرِ شفاء کا حکم رکھتی ہے۔مشرک، ملحد، زندیق، یہودی، نصرانی، مجوسی، بدعتی، بدمعاش، فاسق، فاجر کوئی ہو آیتِ ہٰذا کو سننے کے بعد خدا کی رحمت سے بالکلیہ مایوس ہوجانے اور آس توڑ کر بیٹھ جانے کی اُس کے لیے کوئی وجہ نہیں؛ کیونکہ اللہ جس کے چاہے سب گناہ معاف کرسکتا ہے، کوئی اُس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا، پھر بندہ نا اُمید کیوں ہو۔ (ماخوذ از فوائدِ عثمانیؒ)

اور ایک جگہ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ○﴾
(پ:١٤، سورۃ الحجر، رقم الآیۃ:٥٦، رکوع:٤)

بولا اور کون آس توڑے اپنے رب کی رحمت سے مگر جو گمراہ ہیں۔ (شیخ الہندؒ)

تشریح:

یعنی رحمتِ الٰہیہ سے نا اُمید تو عام مسلمان بھی نہیں ہوسکتے چہ جائیکہ انبیاء علیہم السلام کو معاذ اللہ یہ نوبت آئے۔محض اسبابِ عادیہ اور اپنی حالتِ موجودہ کے اعتبار سے ایک چیز عجیب معلوم ہوئی، اس پر میں نے اظہارِ تعجب کیا ہے کہ خدا کی قدرت اب بڑھاپے میں مجھے اولاد ملے گی۔حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''عذاب سے نڈر ہونا اور فضل سے نا اُمید ہونا دونوں کفر کی باتیں ہیں یعنی آگے کی خبر اللہ کو ہے۔ایک بات پر دعویٰ کرنا یقین کرکے کہ یوں نہیں ہوسکتا یہ ہی کفر کی بات ہے باقی محض دل کے خیال وتصور پر پکڑ نہیں، جب منہ سے دعویٰ کرے تب گناہ ہوتا ہے''۔

گناہوں سے توبہ کی حقیقت:

جو شخص یہ جانتا ہو کہ مجھ سے گناہ ہوگیا ہے چاہے وہ گناہ چھوٹا ہو یا بڑا تو اس شخص کو اللہ رب العزت سے توبہ

کرنی چاہیے، اللہ رب العزت کی بے پایاں رحمت سے اُمید ہے کہ وہ سچی توبہ قبول فرمالیتا ہے، اللہ ہی کا حکم گناہ گاروں سے توبہ کرنے کا ہے، ارشادِ خداوندی ہے:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا الَّـذِيْـنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا﴾(پ:٢٨، سورة تحريم، رقم الآية:٨، ركوع:٢)

اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کی طرف صاف دل کی توبہ۔ (شیخ الہندؒ)

تشریح:

صاف دل کی توبہ یہ ہے کہ دل میں پھر اُس گناہ کا خیال نہ رہے۔ اگر توبہ کے بعد اُن ہی حرافات کا خیال پھر آیا تو سمجھو کہ توبہ میں کچھ کسر رہ گئی ہے اور گناہ کی جڑ دل سے نہیں نکلی۔ ”رزقنا الله منها حظا وافراً بفضله وعونه وهو علىٰ كل شيء قدير“. (ماخوذ از فوائد عثمانیؒ)

اور مزید توبہ کی حقیقت اور اللہ کا بے پناہ فضل واحسان اپنے گناہ گار بندوں پر کیسے ہوتا ہے اس کی مختصر تفصیل سورۂ نساء میں ذکر ہے، افادہ کی غرض سے ہم اس کو بھی شامل کرتے ہیں، ملاحظہ ہو:

﴿اِنَّـمَا التَّـوْبَةُ عَـلَـى الـلّٰـهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّـوْٓءَ بِـجَهَـالَةٍ ثُـمَّ يَتُـوْبُـوْنَ مِـنْ قَـرِيْـبٍ فَـاُولٰٓـئِكَ يَتُـوْبُ الـلّٰـهُ عَـلَيْهِمْ، وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۝﴾

(پ:٤، سورۂ نساء، رقم الآية:١٧، ركوع:٣)

توبہ قبول کرنی اللہ کو ضرور تو ان کی ہے جو کرتے ہیں بُرا کام جہالت سے پھر توبہ کرتے ہیں جلدی سے تو اُن کو اللہ معاف کردیتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا۔

(شیخ الہندؒ)

تشریح:

یعنی توبہ تو بیشک ایسی چیز ہے کہ زنا اور لواطت جیسے سنگین مجرم بھی اس سے اللہ تعالیٰ معاف فرمادیتا ہے جیسا کہ آیتِ مبارکہ سے مفہوم ہوا؛ لیکن اس کا بھی ضرور لحاظ رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنے فضل سے قبولِ توبہ کا ذمہ لے لیا ہے وہ اصل میں اُن لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جو ناواقفیت اور نادانی سے کوئی صغیرہ یا کبیرہ گناہ کر لیتے ہیں؛ مگر اپنی خرابی پر متنبہ اور مطلع ہوتے ہیں تو جب ہی نادم ہوتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں، سوایسوں کی خطائیں اللہ ضرور معاف فرمادیتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے، اس کو معلوم ہے کس نے نادانی سے گناہ کیا اور کس نے اخلاص سے توبہ کی اور حکمت والا ہے، جن توبہ کا قبول کرنا موافق حکمت ہوتا ہے اس کو قبول فرمالیتا ہے۔

فائدہ قید جہالت اور قید قریب سے معلوم ہوگیا کہ جو شخص گناہ تو کرے نادانی سے اور تنبیہ کے بعد توبہ

کرلے جلدی سے تو بقاعدہ عدل وحکمت اُس کی توبہ مقبول ہونی ضرور ہے اور جس نے جان بوجھ کر دیدہ ودانستہ اللہ کی نافرمانی پر جرأت کی یا اطلاع کے بعد اس نے توبہ میں تاخیر کی اور پہلی ہی حالت پر قائم رہا تو بقاعدۂ عدل وانصاف اُس کی خطا اصل میں معافی کے قابل نہیں، اُس کا قبول کر لینا اللہ تعالیٰ کا محض فضل ہے کہ اپنے فضل سے اللہ تعالیٰ ان دونوں کی توبہ کو بھی قبول کر لیتا ہے، یہ اس کا احسان ہے؛ مگر ذمہ داری صرف اوّل صورت میں ہے، باقی میں نہیں۔ (ماخوذ از فوائدِ عثمانیؒ)

آگے ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلَيۡسَتِ التَّوۡبَةُ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ، حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ اِنِّىۡ تُبۡتُ الۡـٰٔنَ وَلَا الَّذِيۡنَ يَمُوۡتُوۡنَ وَهُمۡ كُفَّارٌ، اُولٰۤـئِكَ اَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا۝﴾

(پ:٤، سورۂ نساء، رقم الآية:١٨، ركوع:٣)

اور ایسوں کی توبہ نہیں جو کیے جاتے ہیں بُرے کام یہاں تک کہ جب سامنے آجائے اُن میں سے کسی کی موت تو کہنے لگا میں توبہ کرتا ہوں اور نہ ایسوں کی توبہ جو مرتے ہیں حالتِ کفر میں اُن کے لیے ہم نے تیار کیا ہے عذاب دردناک۔ (شیخ الہندؒ)

تشریح:

یعنی اور ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو برابر گناہ کیے جاتے یں اور باز نہیں آتے، یہاں تک کہ جب موت ہی نظر آ گئی تو اس وقت کہنے لگا کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ اُن کی توبہ قبول ہوگی جو کفر پر مر گئے اور اُس کے بعد عذابِ اُخروی کو دیکھ کر توبہ کریں ایسے لوگوں ے واسطے عذابِ شدید تیار ہے۔

جاننا چاہیے کہ یہ دونوں آیتیں جو دربارۂ قبولِ توبہ اور عدمِ قبولِ توبہ یہاں مذکور ہیں ہم نے جو ان کا مطلب بیان کیا یہ بعض اکابر محققین کی تحقیق کے موافق ہے اور اس میں یہ خوبی ہے کہ قید جہالت اور للفظ قریب دونوں اپنے ظاہری معنیٰ پر قائم رہے...... مفسرین حضرات نے علی العموم جو اِن آیتوں کا مطلب ارشاد فرمایا ہے تو قید جہالت کو احترازی اور شرطی نہیں لیتے؛ بلکہ قید واقعی فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گناہ ہمیشہ جہل اور حماقت سے ہوتا ہے اور قریب کے معنیٰ یہ لیتے ہیں کہ حضور موت سے پہلے جس وقت ہے وہ قریب ہی ہے؛ کیونکہ دنیا کی زندگی قلیل ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کا توبہ قبول فرمانے کا وعدہ اُن سے ہے کہ سفاہت اور عدمِ انجام بینی سے گناہ کر لیتے ہیں اور پھر موت کے آنے سے پہلے تائب ہو جاتے ہیں اور جو لوگ کہ موت کو مشاہدہ کر چکے اور نزع کی حالت کو پہنچ چکے یا جو لوگ کہ کفر پر مر چکے اُن کی توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی۔

فائدہ: جب موت کا یقین ہو چکے اور دوسرا عالم نظر آنے لگے تو اس وقت کی توبہ قبول نہیں اور عالمِ آخرت

کے دیکھنے سے پہلے کی توبہ البتہ قبول ہوتی ہے، اتنا فرق ہے کہ حسبِ تقریر اوّل صورتِ اوّل میں تو قبولِ توبہ قاعدۂ عدل وانصاف کے موافق ہے اور دوسری صورتوں میں قبولِ توبہ اُس کا محض فضل ہے۔ (ماخوذ از فوائدِ عثمانیؒ)

خلاصہ یہ نکلا: مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ کسی بھی گناہ کو معمولی نہیں سمجھتا۔ آپ تصور کیجیے! پرندوں میں بھی بہت ہی چھوٹا ہلکا پرندہ مکھی ہے، اس کے بیٹھنے سے انسان کو اس کے وزن کا بھی پتہ نہیں چلتا ہے؛ باوجود اس کے کہ مؤمن اس کو بھی بہت بھاری اور ثقیل چیز سمجھتا ہے فوراً اس سے توبہ کر کے اللہ سے رجوع کر لیتا ہے، اتنا معمولی گناہ بھی مؤمن کو پہاڑ کی طرح محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک وزنی پہاڑ کی چٹان کے نیچے بیٹھا ہے گویا وہ اس پر گرنے والی ہے، اس کے بالمقابل فاسق کسی بھی گناہ کو ہلکا سمجھتا ہے گویا مکھی تھی اُڑا دی چاہے جتنا بھی بڑا گناہ ہو وہ ہلکے میں لیتا ہے جس سے توبہ کی توفیق اور رجوع الی اللہ سے محروم ہوتا ہے۔

اللہ ہم کو گناہوں سے توبہ کرنے کی توفیق بخشے، گناہوں کو معمولی سمجھنے سے محفوظ فرمائے۔ آمین

❑❖❑

تحفظ ختم نبوت

خود میرے نبی نے یہ بات بتادی ''لَانَبِیَّ بَعْدِیْ''

ازقلم: مولانا جواد احمد خان صاحب رشادی، استاذ دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور

یہ مضمون موجودہ دَور کا نہایت ہی حساس اور اہم ترین موضوع ہے، ہر زمانہ میں فتنوں نے نئی نئی شکل اختیار کی، دَورِ موجودہ میں قادیانی فرقہ دوسرے رُخ سے امت کو گمراہ کرنے کی کوشش کررہا ہے، شکیل بن حنیف اور گوہر شاہی کے رُوپ میں امت کو گمراہ کرنے کی کوشش میں لگا ہے، دل کے اقسام اور تصوف میں اس کی اہمیت کو بتا کر لوگوں کو گمراہ کررہا ہے جگہ جگہ اس کے چیلے اس کی تبلیغ کی ناکام کوشش میں لگے ہوئے ہیں؛ لیکن علماء زبانی وتحریری اعتبار سے اس سے تعاقب میں لگے ہوئے ہیں، اسی تحریری تعاقب میں یہ گراں قدر مضمون ہے، اللہ تعالیٰ پوری ملت کی جانب سے موصوف کو جزائے خیر عطا کرے، آمین۔ (ازمرتّب)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، اگر کوئی شخص اس کے برعکس عقیدہ رکھتا ہے تو وہ کافر اور مرتد ہے۔

چنانچہ قرآن وسنت کے قطعی نصوص سے ثابت ہے کہ نبوت اور رسالت کا سلسلہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کردیا گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ہیں، آپ کے بعد کسی شخص کو منصبِ نبوت پر فائز نہیں کیا جائے گا، قرآن مجید کی سورۂ احزاب آیت نمبر ۴۰ میں ہے: ﴿مَاكَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰـكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں (لیکن ہاں! ایک دوسری قسم کی ابوتِ روحانی ضرور حاصل ہے)؛ چنانچہ اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں، یعنی آپ کی تشریف آوری سے نبیوں کے سلسلے پر مہر لگ گئی، اب کسی کو نبوت نہیں دی جائے گی، پس جن کو ملنی تھی مل چکی ہے؛ اِسی لیے آپ کی نبوت کا دَورہ سب نبیوں کے بعد رکھا جو قیامت تک چلتا رہے گا، حضرت مسیح علیہ السلام بھی اخیر زمانے میں بحیثیت آپ کے ایک اُمتی کے آئیں گے خود ان کی نبوت ورسالت کا عمل اس وقت جاری نہ ہوگا جیسے آج تمام انبیاء اپنے اپنے مقام پر موجود ہیں؛ مگر شش جہت میں عمل صرف نبوتِ محمدیہ کا جاری وساری ہے، حدیث میں ہے کہ اگر آج موسیٰ علیہ السلام زمین پر زندہ ہوتے تو ان کو بھی بجز میری اتباع کے چارہ نہ تھا؛ بلکہ بعض محققین کے نزدیک تو انتیائے سابقین اپنے اپنے عہد میں بھی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیتِ

عظمیٰ ہی سے مستفید ہوتے تھے، جیسے رات کو چاند اور ستارے سورج کے نور سے مستفید ہوتے ہیں؛ حالانکہ سورج اس وقت دکھائی نہیں دیتا اور جس طرح روشنی کے تمام مراتبِ عالمِ اسباب میں آفتاب پر ختم ہوجاتے ہیں، اسی طرح نبوت ورسالت کے تمام مراتب وکمالات کا سلسلہ بھی روحِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوجاتا ہے، اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ رتبی اور زمانی ہر حیثیت سے خاتم النبیّین ہیں اور جن کو بھی نبوت ملی ہے، آپ ہی کی مہر لگ کر ملی ہے، ختمِ نبوت سے متعلق قرآن، حدیث اور اجماع وغیرہ سے سینکڑوں دلائل جمع کر کے بعض علمائے عصر نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، مطالعہ کے بعد ذرا تردد نہیں رہتا کہ اس عقیدے کا منکر قطعاً کافر اور ملّت اسلام سے خارج ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری نبی ہونا جس طرح قرآنی آیات میں صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے اسی طرح احادیثِ نبویؐ میں تواتر کے ساتھ بیان ہوا ہے، خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار تاکید کے ساتھ اپنے آخری نبی ہونے کا اعلان فرمایا ہے اور مختلف تمثیلات کے ذریعہ اس کی وضاحت فرمائی ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''أَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَانَبِيَّ بَعْدِيْ'' میں آخری نبی ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں بے شک رسالت ونبوت ختم ہوگئی، اب میرے بعد کوئی رسول یا نبی نہیں آئے گا۔

خود میرے نبی نے بات یہ بتادی، لا نبی بعدی
ہر زمانہ سن لے یہ نوائے ہادی، لا نبی بعدی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ رسالت ونبوت ختم ہوگئی، میرے بعد نہ کوئی رسول ہے اور نہ کوئی نبی، صحابہؓ پر یہ بات گراں گزری تو آپ نے فرمایا؛ لیکن خوش خبریاں دینے والے، صحابہؓ نے پوچھا خوش خبریاں دینے والے کیا ہیں، تو فرمایا: مسلمانوں کے خواب جو نبوت کے جزء میں سے ایک جزء ہے۔

اس بارے میں اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں؛ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی اس وسیع رحمت پر شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نیا پنے رحم وکرم سے ایسے بڑے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری طرف بھیجا اور انہیں ختم المرسلین خاتم النبیّین بنایا اور یکسوئی والا آسان، سچا اور سہل دین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے کمال کو پہنچا۔

نبوت ختم ہے تجھ پر ❖ رسالت ختم ہے تجھ پر
ترا دین ارفع و اعلیٰ ❖ شریعت ختم ہے تجھ پر

رب العالمین نے اپنی کتاب میں اور خاتم النبیّین نے اپنی متواتر احادیث میں یہ خبر دے دی کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں، پس جو شخص آپ کے بعد نبوت یا رسالت کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا، مفتری، دجال، گمراہ اور گمراہ کرنے والا ہوگا، خواہ وہ شعبدے دکھائے یا جادوگری کرے اور بڑے بڑے کمالات اور عقل کو حیران کرنے والی چیزیں پیش کرے خواہ طرح

طرح کی نیرنگیاں دکھائے، اللہ نے جس کو عقلِ سلیم دی ہو وہ خوب سمجھ سکتا ہے کہ یہ سب دھوکا، فریب اور مکاری ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ ہی میں جھوٹے نبی پیدا ہو گئے تھے، عام طور پر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد مدینہ مکہ اور طائف کے سوا تمام ملک عرب ایسا مرتد ہو گیا کہ لوگ توحید کو چھوڑ کر شرک میں مبتلا ہو گئے؛ حالانکہ یہ سراسر غلط خیال ہے اور خلافِ واقعہ ہے۔

کذابین یعنی جھوٹے مدعیانِ نبوت بھی نمازوں وغیرہ عبادات کے منکر نہیں تھے اور نہ ان کا ارتداد کفر وشرک کی وجہ سے تھا؛ بلکہ صرف اور صرف ختم نبوت کا انکار ہی ان کے ارتداد کا سبب تھا۔

توحید کے بعد ختم نبوت کا عقیدہ ایسے ایمانی مسلمات میں شامل ہے جس کا انکار کرنے سے ایک مسلمان کافر ہو جاتا ہے، صرف یہی ایک تنکیر اس کو کافر بنا دیتی ہے، چاہے اس کے اندر دیگر نناوے وجوہِ اسلام پائی جائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نبوت کا دعویٰ کرنے والوں میں خاص طور پر مشہور مسیلمہ کذاب، سجاح، طلیحہ اسدی، اسود عنسی وغیرہ تھے، ان کا انجام دنیا نے دیکھ لیا، ہر اس شخص کا یہی حال ہوگا جو دعویٔ نبوت کے ساتھ مخلوق کے سامنے آئے گا۔

جس طرح دنیائے عرب میں جھوٹے نبی پیدا ہوئے تھے، اسی طرح عجم میں بھی ماضی قریب کے دَور میں علام احمد قادیانی نبوت کا دعویٰ کر بیٹھا، اس کی تحریروں میں متعدد اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ علام احمد مسلمانوں میں افتراق وانتشار پھیلانے کے لیے انگریزوں کا آلۂ کار بنا ہوا تھا۔

احمدیوں اور غیر احمدیوں میں صرف فلسفیانہ اختلاف ہی نہیں؛ بلکہ ان کے درمیان عقیدے اور اعلانِ نبوت کے بارے میں بھی اختلافات موجود ہیں جو علماء کی رائے میں کسی شخص کو مرتد قرار دینے کے لیے کافی ہیں۔

علامہ اقبال نے بجا طور پر حکومتِ ہند کو مشورہ دیا تھا کہ احمدیوں کو مسلمانوں سے الگ فرقہ تصور کیا جائے، غرض موجودہ دَور میں بھی غلام احمد کے کچھ چیلے بلبلانے لگے جیسے ''شکیل بن حنیف'' اور ''گوہر شاہی'' وغیرہ سر اُٹھانے لگے ہیں اور قادیانی مشن کی تبلیغ بڑی سرگرمی سے کر رہے ہیں۔

ان کے دجل وفریب سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے قادیانیت کی مکاریوں کو ظاہر کرنا ضروری ہے؛ تاکہ مسلمان ان کے دامِ تزویر میں آنے سے محفوظ رہیں، انہیں قادیانیت کا چرچہ کرنے کا حق حاصل ہے تو ہمیں ان کی پول کھول کر اسلام اور عقیدۂ ختمِ نبوت کی مدافعت سے کون روک سکتا ہے۔ ؎

اُصولوں پر جہاں آنچ آئے ٹکرانا ضروری ہے
جو زندہ ہوں تو پھر زندہ نظر آنا ضروری ہے

تذکرۂ صحابہؓ (قسط اوّل)

سیرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ

از: مفتی محمد عمران صاحب شاہی وقاسمی، استاذ مدرسہ عربیہ مرکز العلوم بنگلور

عمر بن خطاب بن نفیل بن عبدالعزی بن رباح بن قرط بن زراح بن عدی بن کعب بن لوی امیر المومنین ابوحفص القرشی العدوی الغاروی ۶ھ نبوی میں کہ جب آپ کی عمر شریف ستائیس سال کی تھی ایمان لائے، ذہبیؒ اور نوویؒ لکھتے ہیں کہ: آپؓ واقعۂ فیل کے تیرہ سال بعد پیدا ہوئے، آپؓ اشرافِ قریش میں سے تھے اور جاہلیت کے زمانہ میں آپؓ کے ساتھ سفارت متعلق تھی یعنی جب قریش کی آپس میں لڑائی ہوتی تھی یا کسی دوسرے ملک سے جنگ ہوتی تھی تو قریش آپؓ کو ہی سفیر بنا کر بھیجا کرتے تھے یا کبھی اگر آپس میں فخر نسب کے اظہار کی ضرورت لاحق ہوتی تھی تو آپؓ ہی اس کام کے لیے روانہ ہو جاتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے متعلق

آپؓ چالیس مَردوں اور گیارہ عورتوں کے بعد مسلمان ہوئے، بعضوں نے کہا ہے کہ انتالیس مَردوں اور تینتیس عورتوں کے بعد مسلمان ہوئے، بعض نے لکھا ہے کہ پینتالیس مَردوں اور گیارہ عورتوں کے بعد ایمان لائے، آپؓ ہی وہ ہستی ہیں کہ آپؓ کے اسلام لانے کے بعد ہی اسلام مکہ میں ظاہر ہوا اور مسلمان نہایت خوش ہوئے۔

آپؓ سابقین اوّلین میں سے ہیں، آپؓ عشرۂ مبشرہ میں داخل ہیں، خلفاءِ راشدینؓ میں آپؓ شمار ہوتے ہیں اور آپؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خسر ہونے کا فخر رکھتے ہیں، آپؓ صحابہ میں بڑے عالم وزاہد تھے، آپؓ سے (۵۳۹) احادیث مروی ہیں، آپؓ سے روایت کرنے والے: ''حضرت عثمان بن عفان، علی، طلحہ، سعد بن عوف، ابنِ مسعود، ابوذر، عمرو بن عبسہ، آپ کے بیٹے، عبداللہ بن عباس، ابنِ زبیر، انس، ابوہریرہ، عمرو بن عاص، ابوموسیٰ اشعری، براء بن عازب، ابوسعید خدری'' اور دیگر صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی: ''الٰہی! اسلام کو عمر بن خطاب، ابوجہل بن ہشام میں سے جس کو آپ چاہیں مسلمان کر کے غلبہ عطا فرمائیے''۔ احمد نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اِس طرح روایت کی ہے کہ میں ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روکنے کے لیے چلا، تو معلوم ہوا کہ آپ مجھ سے

پہلے مسجد پہنچ چکے ہیں، میں آپ سے کسی قدر پیچھے ٹھہر گیا، آپ نے سورۃ الحاقہ پڑھنا شروع کی، میں تالیف قرآن سن کر تعجب کرتا رہا، میں اپنے دل میں کہا: واللہ! یہ شخص شاعر ہی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ قریش کہتے ہیں؛ لیکن جب آپ اس آیت پر پہنچے: ﴿اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ ○ وَمَا ھُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِیْلًا مَّاتُؤْمِنُوْنَ ○﴾ تو میرے دل میں اسلام گھر کر گیا اور مجھے اس کی عظمت معلوم ہوگئی۔ ابنِ شیبہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اسلام لانے کا اِس طرح قصہ بیان کیا کہ: میری ہمشیرہ کو در دِزہ لاحق ہوا تو میں گھر سے نکل کر کعبہ شریف کے پَردوں میں چلا گیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم حجر کی طرف تشریف لائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اونی کپڑا اوڑھے ہوئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کچھ نماز پڑھی اور پھر تشریف لے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے کچھ ایسا کلام سنا جو میں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم چلے تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چلا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کون ہے؟ میں نے کہا عمر ہوں، آپ صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا: عمر! تم میرا رات دن میں پیچھا کبھی نہیں چھوڑتے، میں ڈرا کہ کہیں آپ بددعا نہ کردیں، فوراً میں نے کلمۂ شھادت پڑھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: عمر! اس کو پوشیدہ رکھو، میں نے عرض کیا: قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا نبی بنا کر بھیجا ہے، میں اس کو ضرور ظاہر کروں گا جیسا کہ میں نے شرک کو ظاہر کیا۔

حاکم اور بیہقی وغیرہ نے دلائل میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تلوار لٹکائے ہوئے نکلے، آپ کو راستہ میں قبیلہ بنی زہرہ کا ایک شخص ملا، اُس نے کہا کہ کہاں کا ارادہ ہے؟ آپؓ نے فرمایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کرنے کا ارادہ ہے، اُس نے کہا کہ بنی ہاشم اور بنی زہرہ سے کس طرح امن سے رہوگے؟ آپؓ نے فرمایا معلوم ہوتا ہے کہ تو بھی بے دین ہوگیا، میں اس سے بھی تعجب خیز بات بتلاتا ہوں کہ تمہارے بہنوئی اور بہن دونوں تمہارے دین سے بے دین ہوگئے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے بہنوئی کے مکان کو چلے وہاں حضرت خباب رضی اللہ عنہ بھی تشریف رکھتے تھے، آپؓ کی آہٹ پا کر حضرت خباب رضی اللہ عنہ چُھپ گئے؛ چونکہ یہ تینوں صاحب آہستہ آہستہ سورۂ طٰہٰ پڑھ رہے تھے اور آپؓ کے آجانے پر خاموش ہوگئے، تو آپؓ نے دریافت کیا کہ یہ چپکے چپکے کیا پڑھا جارہا تھا؟ آپ کی بہن بہنوئی نے کہا کچھ نہیں، آپس میں کچھ باتیں کررہے تھے، آپؓ نے کہا کہ معلوم ہوا کہ تم دونوں بے دین ہوگئے ہو، آپ کے بہنوئی نے کہا کہ جب تمہارے دین میں حق ہی نہ ہو، اس پر آپ کو غصہ آیا، کود کر اپنے بہنوئی کو بڑی سختی سے زمین پر پٹخا، آپ کی بہن نے انہیں چھٹانا چاہا تو آپ نے اپنی بہن کو زور سے دھکا دیا جس سے ان کے بھی چوٹ آئی اور منہ خون سے تر بتر

ہوگیا، آپ کی بہن نے نہایت غصہ سے کہا کہ تمہارا دین ہی سچا نہیں تو میں گواہی دیتی ہوں کہ سوائے ایک معبود کے کوئی دوسرا عبادت کے لائق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ آپؓ نے فرمایا کہ اچھا مجھے وہ کتاب دو جو تمہارے پاس ہے؛ تاکہ میں اسے پڑھوں، آپ کی بہن نے کہا کہ تم ناپاک ہو، اس مقدس کتاب کو پاک ہی لوگ چھو سکتے ہیں، اوّل غسل کیجیے یا کم ازکم وضو کر لیجیے، آپ نے وضو کیا اور کتاب لے کر پڑھی، اس میں سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی، آپ جس وقت اس آیت پر پہنچے: ﴿اِنَّنِیْ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ﴾ تو آپ نے فرمایا کہ مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جلدی ملاؤ، جس وقت حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے یہ سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر آئے اور کہا عمر میں تم کو بشارت دیتا ہوں کہ جمعرات کی رات کو ہمارے آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعا مانگی تھی کہ الٰہی! اسلام کو عمر بن خطاب یا ابوجہل بن ہشام کے مسلمان ہونے سے غلبہ عطا فرماؤ، میری رائے میں یہ اسی کا اثر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت صفا کے قریب مکان میں تھے، حضرت خباب رضی اللہ عنہ آپ کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں چلے جس مکان میں حضرت تشریف فرما تھے، اس کے دروازہ پر حضرت حمزہ، حضرت طلحہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم بھی بیٹھے ہوئے تھے، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے انہیں دیکھ کر کہا کہ عمر آرہے ہیں، اگر اللہ ان کے ساتھ نیکی کا ارادہ رکھتے ہیں تو یہ میرے ہاتھ سے بچ جائیں گے اور اگر ان کا ارادہ کچھ اور ہے تو ان کا قتل کرنا ہم پر بہت آسان ہے، اس اثناء میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ان تمام حالات کی وحی آچکی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکان سے نکل کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دامن اور تلوار پکڑ کر فرمایا: عمر! یہ فسادات کیا ولید بن مغیرہ جیسا حشر ہونے تک باقی رہیں گے، آپ نے کلمۂ شہادت پڑھا اور مسلمان ہوگئے۔

بیہقی نے حضرت اسلم رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ہم سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے زیادہ جانی دشمن تھا، ایک دن بڑی کڑی گرمی میں مکہ کی گلی میں جارہا تھا کہ ایک شخص ملا اور اُس نے مجھ سے کہا کہ: اے عمر! بڑے تعجب کی بات ہے کہ تم اپنے کو کچھ سمجھتے ہو اور تمہارے گھر میں وہ کام ہوجاتے ہیں کہ تمہیں خبر تک نہیں ہوتی، میں نے کہا کہ کیا ہوا؟ اس نے کہا کہ تمہاری بہن مسلمان ہوگئی، میں غصہ میں پیچھے لوٹا اور بہن کا دروازہ کھٹکھٹایا اندر سے پوچھا کون ہے؟ میں نے کہا عمر ہوں، اندر کے تمام آدمی گھبرا کر اور مجھ سے ڈر کر چھپ گئے، ایک کتاب جو وہ پڑھ رہے تھے اسے رکھ دی اور جلدی میں اٹھانا بھول گئے، میری بہن نے دروازہ کھولا، میں نے اسے جان کی دشمن تو بے دین ہوگئی یہ کہہ کر جو میرے ہاتھ میں تھا اس کے سر پر کھینچ مارا، سر میں خون نکل آیا، بہن نے رو کر کہا: عمر! میں بے دین ہوگئی یا جو کچھ میری سمجھ میں آیا کر لیا، یہ

سن کر میں اندر گیا اور چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا، میں نے دیکھا کہ ایک کتاب کھلی ہوئی ہے، میں نے کہا یہ کیا ہے میرے پاس لاؤ؟ بہن نے جواب دیا کہ تم اس کے اہل نہیں؛ کیونکہ تم جنابت سے پاک نہیں اور اس کو پاک ہی لوگ ہاتھ میں لیتے ہیں، میں نے اصرار کیا، حتیٰ کہ وہ لائی، میں نے جو کھولا تو شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا ہوا تھا، میں یہ اللہ کا نام دیکھ کر ہیبت سے کانپ گیا اور کتاب ہاتھ سے چھوٹ گئی، جب ذرا میرے اوسان بجا ہوئے تو میں نے پھر اُٹھا کر پڑھا، اس میں لکھا ہوا تھا: ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾ پھر کانپ اٹھا، سہ بار پڑھنے پر جب میں آیت ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (یعنی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ) تک پڑھا تو میں نے کہا: اَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّااللّٰهُ یہ سن کر تمام آدمی جو گھر میں موجود تھے میری طرف دُوڑے اور زور سے تکبیر کہی اور کہا کہ تمہیں مبارک ہو، پیر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ہی دعا فرما چکے تھے کہ الٰہ العالمین! اپنے دین کو ان دو شخصوں ابوجہل بن ہشام یا عمر بن خطاب میں سے جسے آپ چاہیں اس کے ساتھ غلبہ عطا فرمائیے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت صفا پہاڑ کے نیچے مکان میں تشریف رکھتے تھے، یہ لوگ مجھے وہاں لے گئے، میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹایا، پوچھا کون ہے؟ میں نے عرض کیا عمر ہوں؛ چونکہ لوگ میری دشمنی سے واقف تھے میرا نام سن کر کسی کو دروازہ کھولنے کی جرأت نہ ہوئی، حتیٰ کہ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا کہ دروازہ کھول دو، لوگوں نے دروازہ کھول دیا اور دو آدمیوں نے میرے بازو پکڑ لیے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے چھوڑ دو، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا دامن پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور فرمایا عمر مسلمان ہو جاؤ، اے اللہ! اسے ہدایت دو، میں نے کلمۂ شہادت پڑھا اور مسلمانوں نے اس زور سے تکبیر کہی کہ مکہ گلیوں میں آواز سنائی دی کہ لوگ ڈر گئے اور کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ مجھ سے سر پھٹول کرے؛ لیکن دوسرے مسلمانوں سے برابر مار پیٹ ہوتی تھی۔

اصلاحِ معاشرہ

دینی خدمت گزاروں کے معاش کا مسئلہ

ازقلم: فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی، ترجمان وسکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

ایک زمانہ تھا جب مسلم سماج میں علماء اور حفاظ کی بہت کمی تھی، نماز تراویح کے لیے لوگ کئی کئی ماہ پہلے سے حافظ کو تلاش کرتے تھے، اور تراویح پڑھانے والوں کے بڑے ناز و انداز اور مطالبات ہوتے تھے، علماء تو بہت ہی کم ہوتے تھے، ایک متوسط درجہ کے شہر میں علماء کی تعداد اتنی کم ہوتی تھی کہ انگلیوں پر گنا جا سکتا تھا، بیشتر مسجدوں میں صرف حافظ امام ملتے تھے، جمعہ میں لوگ کتاب پڑھ کر سنا دیتے تھے، زیادہ تر مسجدوں میں زبانی بیان کرنے والے لوگ نہیں ہوتے تھے، دیہاتوں کی صورت حال یہ تھی کہ نکاح پڑھانے کے لیے بھی دور دور سے عالم کو بلا کر لاتے تھے، آج سے تیس چالیس سال پہلے تک ملک کے بیشتر حصوں میں یہی صورت حال تھی، مدارس کم تھے اور دارالاقامہ والے مدارس اور کم تھے، اور وہ اقامتی مدارس جن میں عالمیت تک مکمل تعلیم ہو، بہت ہی کم تھے، پوری ریاست میں چند مدارس ہوتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ علماء نے جو مدارس کی تحریک شروع کی تھی، وہ ترقی کرتی گئی، آج چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی علماء کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے، قصبات اور بڑے دیہاتوں میں بھی علماء علم کی روشنی پھیلانے کا کام کر رہے ہیں، اب دور اُفتادہ قریہ جات ہی ہیں جہاں کوئی مدرسہ اور مکتب نہیں ہے، یا علماء و حفاظ نہیں ہیں اور اس میں بھی دخل مقامی مسلمانوں کی غفلت، جہالت اور بے توجہی کا ہے، یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اب بڑے بلکہ متوسط شہروں میں بھی ضرورت سے زیادہ مدارس قائم ہو گئے ہیں، مثلاً فرض کیجیے کہ کسی شہر میں پچیس ہزار مسلمان آباد ہوں تو وہاں زیادہ سے زیادہ ڈھائی سو بچوں کے بارے میں امید رکھ سکتے ہیں کہ وہ حفظ قرآن مجید یا عالم کورس کی تعلیم حاصل کریں گے، یہ تعداد ڈھائی فیصد ہوتی ہے؛ لیکن آج کل بہت سے علاقوں میں اتنے چھوٹے چھوٹے مدارس ہیں کہ ان میں چالیس پچاس بلکہ بیس پچیس طلبہ پڑھتے ہیں اور وہ ابتدائی درجات کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، اگر دیانت کے ساتھ ایسے پانچ چھ مدارس کو جمع کر دیا جائے تو ایک مدرسہ کی تعداد بنتی ہے، یہ تیس چالیس اور پچاس ساٹھ بچوں کی درسگاہوں کی کثرت کی وجہ سے وسائل ضائع ہوتے ہیں؛ چوں کہ ہر ادارہ میں کلاس کے اعتبار سے استاذ رکھنا ہوتا ہے، چاہے کلاس میں پانچ طالب علم ہوں یا پچیس، ہر ادارہ میں

منتظم اور طباخ کی ضرورت پیش آتی ہے، اگر پانچ اداروں کو یکجا کر دیا جائے تو نصف سے بھی کم خرچ میں ان تمام طلبہ کی تعلیم ہو سکتی ہے، اس کی وجہ سے مستحق مدارس کی آمدنی کم ہو جاتی ہے، اور وہ اس موقف میں نہیں ہوتے کہ اساتذہ کو مناسب معاوضہ دیں اور سہولتیں فراہم کر سکیں، دوسری طرف تمام فارغین اپنا معاش مدرسہ اور مسجد ہی میں تلاش کرتے ہیں، یہ بھی مدارس کی معاشی کمزوری کی ایک وجہ ہے۔

بہر حال مدارس کی یہ کثرت مفید ہو یا نہیں اور مناسب ہو یا غیر مناسب؛ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس کی وجہ سے طلبہ کی پہلے سے زیادہ تعداد بڑے مدارس میں پہنچتی ہے، پھر بڑے مدارس کا حال یہ ہے کہ ان کے یہاں تعلیمی مراحل کی تقسیم نہیں ہے، جیسا کہ دنیا کے تمام تعلیمی نظام میں ہوا کرتی ہے، جو مدارس درس نظامی کہلاتے ہیں، عام طور پر ان میں تعلیم کی ابتداء عربی زبان کے گرامر کی ایک کتاب ''میزان الصرف'' سے ہوتی ہے، اب صورت حال یہ ہے کہ جس بچے نے ''میزان الصرف'' کی جماعت میں داخلہ لے لیا، اس کے لیے دو ہی راستے ہیں، یا تو بخاری شریف تک پہنچے اور مکمل عالم و فاضل کی سند لے کر تعلیم کی دنیا سے باہر آئے، اور اگر اس کا ذہن ساتھ نہ دے یا گھریلو حالات ساتھ نہ دیں تو تھک ہار کر بیٹھ جائے، تعلیمی سلسلہ کو منقطع کر دے اور اس حال میں مدرسہ سے باہر آئے کہ اس کے پاس کوئی سند نہ ہو، اس کا نتیجہ ہے کہ سند یافتہ کم صلاحیت علماء کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، دوسری طرف بڑے مدارس کی شکایت بھی قائم ہے کہ ہمیں باصلاحیت اور باکردار اساتذہ نہیں ملتے۔

یہ بات بھی ظاہر ہے کہ معاش انسان کی بنیادی ضرورت ہے، کوئی شخص اس ضرورت سے مستغنی نہیں ہو سکتا، نہ حافظ نہ مولوی، نہ عالم نہ پیر، دنیا کی بعض قوموں میں یہ روایت ہے کہ ان کے مذہبی قائدین نہ شادی کرتے ہیں نہ کماتے ہیں؛ بلکہ وہ قوم کے نذرانوں پر اپنی زندگی گزارتے ہیں اور جب شادی نہ ہو، بیوی بچے نہ ہوں تو یوں بھی ان کی ضروریات محدود ہو جاتی ہوں گی، ہمارے ملک میں بھی اکثر مذہبی گروہوں کا یہی حال ہے؛ لیکن اسلام ایسے توکل کا قائل نہیں ہے، اکابر صحابہؓ، بڑے بڑے تابعین، فقہاء و محدثین صنعت و تجارت کے ذریعہ اپنی ضرورتیں پوری کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ دین کی خدمت بھی کرتے تھے، اسلام نے ہنرمند اور باصلاحیت کو بے کار، کاہل اور سست مومن کے مقابلے بہتر قرار دیا ہے؛ لیکن دشواری یہ ہے کہ جب طلب کے مقابلہ رسد بڑھ جائے اور کسی میدان میں جتنے افراد کار کی ضرورت ہو، اس سے زیادہ افراد تیار ہونے لگیں تو چیز سستی ہو جاتی ہے اور انسان کی قدر گھٹ جاتی ہے، اس وقت مدارس سے فارغ ہونے والے نئے فضلاء اسی صورت حال سے دوچار ہیں، ضرورت ایک کی ہوتی ہے اور کئی لوگ اس کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں، پھر اگلا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ عام طور پر اس کام کے لیے جس معاوضہ کی ادائیگی کا رواج ہے، اس سے بہت کم پر

راضی ہوجاتے ہیں، اگر یہ راضی ہونا اللہ کے دین کی خدمت اور قرآن وسنت کے اشاعت کے جذبہ سے ہوتب تو یہ فائدہ کا سودا ہے، اور ایسا سوچنے والے لوگ بھی الحمدللہ موجود ہیں اور منجانب اللہ لوگوں کے دلوں میں ان کی قدر بڑھ جاتی ہے؛ لیکن بہت سے لوگوں کی نیت اتنی بلند نہیں ہوتی، اور وہ مجبوری سمجھ کر اس پر راضی ہو جاتے ہیں، وہ اپنی سوچ کے اعتبار سے دنیا کا نقصان بھی اٹھاتے ہیں اور اپنی نیت کے اعتبار سے آخرت کے نقصان کا بھی اندیشہ ہے۔

اس لیے نوجوان فضلاء میں شدت سے معاشی محرومی کا احساس پایا جاتا ہے، اس احساس کو کئی باتیں بڑھاتی ہیں، سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ آج سے چالیس پچاس پہلے پرائیویٹ ملازمتوں اور گورنمنٹ ملازمتوں کی تنخواہیں بھی کچھ بہت زیادہ نہیں تھیں، اب چوں کہ ہندوستان افرادی وسائل کے اعتبار سے چین کے بعد دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے؛ اس لیے ترقی یافتہ ممالک کی کمپنیاں اپنا کاروبار یا کاروبار کے انتظامی اور تجارتی دفاتر ہندوستان میں قائم کررہے ہیں، ان کمپنیوں میں کام کرنے والے نوجوانوں کو ہندوستان کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کی تنخواہیں ملتی ہیں؛ لیکن وہ تنخواہیں ان کے ملکوں کے لحاظ سے بہت کم ہوتی ہیں، اب اگر ایک ماں باپ کے پانچ بچے ہیں، چار عصری تعلیم کے میدان میں ہیں اور وہ مختلف کمپنیوں میں خدمت انجام دے کر اونچی تنخواہیں حاصل کرتے ہیں، اور ایک بھائی کسی مسجد میں امامت کرتا ہے یا کسی مدرسہ میں پڑھاتا ہے اور اس کی تنخواہ اپنے دوسرے بھائیوں کے مقابلہ مشکل سے دس بیس فیصد ہوتی ہے تو ایک ہی گھر میں دوسرے بھائیوں اور ان کے بال بچوں کا جو دنیوی معیار ہے، وہ اس بھائی سے بہت اونچا ہے، اگر مدرسہ سے پڑھا ہوا ایک فاضل قرآن وحدیث کی برکت سے اپنی خواہش پر قابو پا بھی لے اور اپنے آپ کو قناعت پر آمادہ کرلے تب بھی یہ بہت مشکل ہے کہ اس کے بیوی اور بچے بھی اس پر راضی ہوجائیں، اور ایک طرح کی کشمکش پیدا ہوجاتی ہے، ان فضلاء کو بعض دفعہ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ انھوں نے دینی تعلیم کے میدان میں آکر غلطی کی ہے، نعوذ باللہ۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ ان کو اداروں کے ذمہ داران اور مساجد کمیٹیوں کے ارکان کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے رہن سہن کا معیار ہم سے اونچا ہے، ان کے پاس گاڑی ہے، دیگر سہولتیں ہیں، ہمارے پاس یہ سب نہیں ہیں، یا کم معیار کی ہیں، اس سے ایک طرح کا جذبۂ منافرت جنم لیتا ہے، وہ اس بات کو سوشل میڈیا پر بھی لکھتے ہیں، لوگوں کے درمیان بھی کہتے ہیں؛ لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا، پھر اس سے ان کی خفگی اور زیادہ بڑھتی ہے؛ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک قدیم استاذ یا ذمہ دار تیس چالیس خدمت کرکے جس مقام پر پہنچا ہے، آپ آج ہی وہ مقام حاصل کرلیں، یہ کیسے ممکن ہے؟ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تنخواہوں میں اضافہ ہوتا

ہے، ان کے بچے بڑے ہوتے ہیں اور ان کی آمدنی بھی والد کے لیے معاشی تقویت کا سبب بنتی ہے، ان کی طویل خدمت کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت پیدا ہوتی ہے اور وہ ان کے خاموش تعاون کو اپنے لیے وجہ سعادت سمجھتے ہیں، یہ چیزیں ان کے لیے زندگی کے آخر حصہ میں فراخی کا باعث بنتی ہیں؛ اگر چہ یہ حقیقت ہے کہ بعض چھوٹے چھوٹے ادارے جس کے ذمہ دار کسی خاص ملّی ضرورت کے بغیر ادارے چلاتے ہیں، ان کے پاس بہت جلد بہت سی سہولتیں مہیا ہو جاتی ہیں؛ لیکن یہ ادارے بھی اور ان کے ذمہ داران بھی امت کی نظر میں بے وزن اور بے وقعت ہیں، نہ ان کے یہاں حساب و کتاب ہے، نہ کوئی مجلس انتظامی ہے، ایسے چند ادارے ضرور ہیں، بعض تو ایسے بھی ہیں، جن کا زمین پر کوئی وجود ہی نہیں ہے، صرف تعارف ناموں میں آپ ان کا نام پڑھ سکتے ہیں؛ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ بیشتر مدارس کی صورت حال ایسی نہیں ہے، اور اس کا انتظام کرنے والی شخصیت یا کمیٹی حساب و کتاب کے نظام کے ساتھ پورے کام کو انجام دیتی ہے۔

ادارے کی انتظامیہ کے لیے مشکل یہ ہے کہ ان کا انحصار عوامی تعاون پر ہے، جو تعاون ادارہ کو حاصل ہو، اس سے بڑھ کر وہ کیسے اپنے عملہ کا حق الخدمت متعین کر سکتے ہیں، گورنمنٹ کے پاس تو بے انتہاء دولت ہے اور وہ بین الاقوامی اداروں سے قرض لینے کا بھی بڑا ''حوصلہ'' رکھتی ہے، اور جو کمپنیاں ہیں وہ تجارتی ادارے ہیں، عصری تعلیمی اداروں کا بھی یہی حال ہے، وہ طلبہ سے موٹی موٹی فیس لیتے ہیں اور ان کا مقصد ہی تجارت ہے؛ لیکن دینی ادارے چریٹیبل ادارے ہیں، جہاں اللہ کے بھروسہ طلبہ کے لیے مفت تعلیم اور ضروریات کا وعدہ کیا جاتا ہے، وہ ظاہر ہے کہ اپنی آمدنی کے دائرہ ہی میں نظم و نسق چلا سکتے ہیں، ملک کے بعض بڑے تاریخی ادارے ایسے ضرور ہیں جنھوں نے تنخواہوں کا اعلیٰ معیار رکھا ہے؛ مگر ان کی ایک تاریخ ہے، جو اصحاب خیر کی خصوصی توجہ کا باعث بنتی ہے، یا صنعتی وتجارتی گروپوں نے ان کی کفالت قبول کر لی ہے، عام مدارس ان کی راہ پر نہیں چل سکتے؛ اس لیے یہ بات سمجھنی چاہیے کہ ہم نے جس راستے کا انتخاب کیا ہے، وہ پھولوں کی سیج نہیں ہے، کانٹوں کا بستر ہے، یہ بادشاہوں اور عیش کوشوں کا راستہ نہیں ہے، یہ وارثین انبیاء کا راستہ ہے، ہمیں اسی ذہن کے ساتھ کام کرنا چاہیے!!!

(جاری.....)

اصلاحِ معاشرہ (قسط اوّل)

پڑوسیوں کے حقوق

ازقلم: حضرت مولانا مفتی سیّد محمد عفان صاحب منصور پوری (صدر المدرسین جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ)

پڑوسی کا صرف اتنا ہی حق نہیں ہے کہ اسے تکلیف نہ دی جائے؛ بل کہ جن چیزوں سے اسے تکلیف پہنچنے کا اندیشہ بھی ہو، شریعت کہتی ہے کہ اس سے بھی بچا جائے اور ہر طرح کی بھلائی کا معاملہ اس کے ساتھ کیا جائے۔ علماء فرماتے ہیں: اگر کسی کا پڑوسی تنگ دست ہو اور اس کے پڑوس میں رہنے والا مالدار ہو اور اس نے اپنے پڑوسی کی نگہداشت نہ کی، خیال نہ رکھا تو قیامت کے دن یہ غریب پڑوسی اس مالدار پڑوسی کا دامن پکڑے گا اور اللہ سے شکایت کرے گا کہ اے پروردگارِ عالم! اس سے پوچھیے! اس نے میرے لیے اپنا دروازہ بند کیوں رکھا؟ میرے ساتھ بھلائی کرنے سے اس کو کس نے روکا تھا؟ "**والمعروف، يقال: الجار الفقير يتعلق بجاره الغني يوم القيامة، ويقول: يارب! سل هذا، لم منعني معروفه وسد بابه دوني**". (الدرالمنضد ٤١٩/١ بحواله بريقة شرح طريقه ١٠٦/٤)

وہ شخص مؤمن نہیں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: "**ليس بمومن من بات شبعان و جاره إلى جنبه جائع**". (أخرجه أبو يعلى ٢٦٩٩) وہ شخص مومن نہیں جو پیٹ بھر کھانا کھا کر سو جائے اور اس کا پڑوسی بھوکا سوتا رہے، یہ کیسا ایمان ہے کہ تم پیٹ بھر کھانا کھا رہے ہو اور پڑوسی بھوکا سو رہا ہے۔

ہمسائیگی کے حقوق

قال النبي صلى الله عليه وسلم أتدرون ماحق الجار؟ إن استعانک أعنته، وإن استقرضک أقرضته، و إن افتقرف جُدت عليه، و إن مرض عدته، و إن مات اتبعت جنازته، وإن أصابه خير هنأته، وإن أصابته مصيبة عزيته، ولا تستطيل عليه بالبناء فتحجز عنه الريح إلا بإذنه، وإن اشتريت فاكهة فاهد له، وإن لم تفعل فأدخله سرا، ولا يخرج بها ولدک ليغيظ بها ولده، ولا تؤذ بغبار قدرک إلا أن تغرف له منها. أتدرون ما حق الجار؟ والذي نفسي بيده لا يلغ حق الجار إلا من رحم الله تعالىٰ. رواه الغزالي –رحمه الله– في الأربعين. (الدرالمنضد، بحواله الدرالمنضد ٤٢٠/١)

ایک موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا: جانتے ہو پڑوسیوں کے حقوق کیا ہیں؟ پھر آپ نے تفصیل کے ساتھ پڑوسی کے حقوق بیان فرمائے۔

(۱) اگر تمہارا پڑوسی تم سے مدد مانگے تو تم اس کی مدد کے لیے فوراً آگے آؤ۔

(۳) اگر تمہارا پڑوسی تم سے قرض مانگے اور تمہاری حیثیت واستطاعت ہو تو اس کو قرض دے دو۔

(۴) اگر تمہارا پڑوسی محتاج وضرورت منداور پریشان حال ہو جائے تو اس کے ساتھ سخاوت کا معاملہ کرو۔

(۵) اگر پڑوسی بیمار ہو جائے تو اس کی مزاج پرسی کے لیے جاؤ۔

(۶) اگر پڑوسی کا انتقال ہو جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ قبرستان تک جاؤ۔

(۷) اگر پڑوسی کو کوئی خوشی کی چیز پیش آئے، مثلاً اس کے یہاں بچہ کی پیدائش ہو یا اس کو کسی بھی اعتبار سے کامیابی ملے تو جیسے ہی تم کو خبر ملے اس کو مبارکبادی دو، اس کی خوشی میں شریک ہو، اس کو یہ احساس دلاؤ کہ اس کی خوشی صرف اس کی نہیں؛ بلکہ تمہاری بھی خوشی ہے اور جب پڑوس کو پڑوس سے یہ جذبات ملیں گے تو دونوں آپس میں محبت ومودت کرنے والے بن جائیں گے۔

(۸) اگر پڑوسی کو کوئی مصیبت پیش آجائے تو اس کی تسلی کا سامان کرنے والے بنو، کسی حادثہ کا وہ شکار ہو جائے، اس کا کوئی عزیز وقریب دنیا سے چلا جائے، جس کا اس کے اُوپر اثر ہو تو جا کر اس کی تعزیت کرو، تسلی کے بول بولو۔

(۹) اپنے پڑوسی کی دیوار سے اتنی اونچی اپنی دیوار مت کرو کہ اس کے گھر کی ہوا رک جائے، اگر تم ایسا کرنا ہی چاہتے ہو تو اس سے اجازت لے لو کہ مجھے دیوار اونچی کرنی ہے، یہ مجبوری ہے، یہ پریشانی ہے، وہ اجازت دیدے تو تم اونچی کرلو، وہ منع کردے تو بہتر یہی ہے کہ جس طرح تم تازی ہوا کھانا چاہتے ہو، وہ بھی تو ہوا کھانا چاہتا ہے، ٹھیک ہے دیوار تمہاری ہے، زمین تمہاری ہے؛ لیکن ایک پڑوسی کا، ایک انسان کا خیال رکھنا اسلام اور ایمان کی علامت ہے، آج یہی اخلاق ہماری زندگی سے ختم ہوتے چلے جارہے ہیں، اب تو ایک اینٹ رکھنے پر لڑائی ہو جاتی ہے، دیوار کھڑی کرنا تو دُور کی بات۔

(۹) اگر کوئی بازار سے پھل خرید کر لا رہے ہو تو پڑوس میں ہدیہ بھی دو، خود کھا رہے ہو، پڑوسی کو نہیں کھلا رہے، اس نیت کے ساتھ خریدو کہ خود بھی کھاؤں گا، پڑوسی کو بھی کھلاؤں گا، اور پھر فرمایا: اگر تمہاری اتنی حیثیت وہمت نہیں کہ پڑوسیوں کو کچھ دے سکو تو خاموشی کے ساتھ یہ پھل اپنے گھر میں لے کر آؤ، اس کو پتہ نہ چلے، پہلی ذمہ داری تو یہ ہے کہ اس کو بھی دو؛ لیکن اگر اتنی حیثیت نہ ہو تو ایسی خاموشی سے لاؤ کہ اس کو محسوس نہ ہو سکے؛ ورنہ اس کے دل پر گرانی ہوگی کہ میں تو لا نہیں پا رہا ہوں اور میرا پڑوسی لا رہا ہے اور کھا رہا ہے۔

(۱۰) اپنی ہانڈی کی بو سے بھی اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ، ہاں! اگر پکوان اس کے یہاں بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہو تو ٹھیک ہے؛ لیکن اگر بھیجنے کا ارادہ نہیں ہے، خود پکا کر کھانا ہے تو ایسے پکاؤ کہ اس کی بو بھی پڑوسی کے یہاں نہ جائے۔

یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی جامع نصیحتیں ہیں کہ اگر انسان ان پر عمل کرنے والا بن جائے گا تو دل میں نفرت وعداوت کے لیے کوئی جگہ نہیں رہ جائے گی۔ لوگ آپس میں ایسے شیر وشکر ہو کر رہیں گے کہ اس کا لطف ہی کچھ اور ہوگا۔

امام صاحب کے کریمانہ اخلاق

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے پڑوس میں ایک موچی رہا کرتا تھا۔ رات کے وقت جب وہ اپنے گھر لوٹتا تو شراب کے نشے میں دھت ہو جاتا اور پھر وہ پوری رات اپنے گھر کی چھت پر چڑھ کر ڈھول تاشے میں لگا رہتا تھا جس سے پڑوسیوں کی نیند وآرام میں خلل پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ کئی دن گذر گیے حضرت کو پڑوس سے گانے بجانے کی آواز نہیں آئی۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ پولس اس کو گرفتار کر کے لے گئی اور جیل میں ڈال دیا۔ حضرت امام صاحب پولیس افسر کے پاس گیے۔ وہ حضرت کو آتا دیکھ کر کھڑا ہو گیا کہ حضرت آپ یہاں کیوں تشریف لے آئے۔ فرمایا کہ مقصد میرا ہے، اس لیے میں ہی تمہارے پاس آیا ہوں۔ پوچھا کہ حضرت کیا مقصد ہے؟ فرمایا کہ میرے پڑوس میں فلاں آدمی رہتا ہے اس کو گرفتار کر لیا گیا ہے، میں اس کی سفارش کے لیے آیا ہوں۔ وہ پولس افسر کہنے لگا کہ حضرت آپ کی ہی پریشانی اور محلّہ والوں کو تکلیف پہچانے کی وجہ سے اس کو جیل بھیجا گیا ہے اور آپ ہی اس کی سفارش کے لیے آرہے ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ سب سے زیادہ ناراض آپ ہی اس سے ہوں گے اس لیے کہ اس کا گھر سب سے زیادہ قریب آپ ہی کے ہے۔ حضرت نے فرمایا وہ اس کا عمل ہے اور یہ ہمارا عمل ہے۔ وہ ہمارا پڑوسی ہے ہم اس کو تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتے۔ جہاں تک ہو سکے گا ہم اس کی مدد کریں گے۔ اگر تمہارے اختیار میں ہے تو تم ہماری سفارش قبول کرو اور اس کو میری ضمانت پر رہا کرو۔

چنانچہ اس کی رہائی ہوگئی۔ جب وہ رہا ہو کر گھر آ گیا تو امام صاحب اس کو مبارک باد دینے کے لیے خود اس کے گھر تشریف لے گیے۔ وہ تو حضرت دیکھ کر پانی پانی ہو گیا۔ پھر بعد میں اس کو لوگوں نے بتایا کہ کہ تو حضرت ہی کی سفارش کی وجہ سے جیل سے چھوٹ کر آیا ہے، تو اس پر بڑا اثر ہوا گناہوں سے توبہ کی اور حضرت کا مطیع وفرماں بردار بن کر زندگی گذارنے کا عہد کیا۔

جو شخص گناہوں میں ڈوبا ہوا تھا اس کے ساتھ امام صاحب نے ایسا معاملہ فرمایا کہ جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس شخص کو میں نے سب سے زیادہ پریشان کر رکھا تھا وہی آدمی میرے سفارش کرنے

کے لیے جیل میں گیا اور مجھے چھڑا کر لایا؛ لیکن امام صاحب نے برائی کرنے والے کے ساتھ اچھا معاملہ کر کے اس کے دل کو جیت لیا۔(تاریخ بغداد للخطیب البغدادی ۳۴۱/۱۳)

ایمان کی علامت

قال النبيؐ: من كان يؤمن بالله واليوم الاخر فليحسن إلى جاره، و من كان يومن بالله واليوم الاخر فليكرم ضيفه، ومن كان يومن بالله واليوم الاخر فليقل خيرا أوليصمت. (أخرجه أحمد: ۳۱/٤)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث پاک میں ایمان والوں کی تین علامات اور نشانیاں بیان فرمائیں: (۱) جو آدمی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھنے والا ہو اس کو اپنے ہمسائے اور پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک و بہترین برتاؤ کرنا چاہیے۔ اس کا تفصیلی ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

مہمان نوازی

دوسری چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والا ہے اس کو اپنے مہمان کا اکرام ضیافت اور میز بانی کرنی ہوگی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعہ پر حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے فرمایا: **''إن لزورک علیک حقا''** تمہارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے۔(بخاری شریف)

ایک موقعہ پر فرمایا: **''الضيافة ثلاثه أيام وجائزته يوم و ليلة ولا يحل لرجل مسلم أن يقيم عند اخيه حتى يؤتمه؟ قال: "يقيم عنده ولا شئ له يقريه به''** مہمانی تین دن اور تین رات سے اور مہمان کا خصوصی اعزاز ایک دن ایک رات ہے، کسی مہمان کے لیے یہ ناجائز نہیں ہے کہ وہ اتنا طویل قیام کرے کہ میزبان کو گناہ گار کر دے، یعنی اس کے پاس میزبانی کے لیے اسباب ہی باقی نہ رہیں۔

میزبانی کے آداب

مہمان کا اکرام کیا جائے، یعنی اس کے آنے پر خوشی کا اظہار ہو، چہرے پر بشاشت ہو اور تعلق بھری گفتگو ہو، بذات خود مہمان کی خدمت اور خیر گیری کی کوشش کی جائے، چاہے خدام موجود ہوں، اس لیے کہ مہمانوں کی خدمت انسان کی شان گھٹاتی نہیں؛ بل کہ بڑھاتی ہے۔

اگر کھانے کے وقت مہمان کی آمد ہوئی ہوتو پھر اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ آپ کھانا کھائیں گے یا نہیں؛ بل کہ دستر خوان پر کھانا رکھ دیا جائے جتنی خواہش ہوگی کھالیا جائے گا۔

اسی طرح جب دستر خوان پر مہمان کے ساتھ کھانا کھایا جائے تو اس سے پہلے فارغ نہ ہوں، اگر پیٹ بھر بھی گیا ہوتو بھی شرکت کا احساس دلاتے رہیں تا کہ مہمان تنگی محسوس نہ کرے، مہمان جانے لگے تو دروازہ تک اس کو رخصت کرنے کے لیے جائیں۔

میزبانی کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ دستر خوان پر کوئی چیز مہمان سے چھپائی نہ جائے یہ بخل اور کنجوسی کی علامت ہے۔

لطیفہ

ایک بخیل کو مہمان کے آنے کی اطلاع ملی اس کے سامنے روٹی، مکھن اور شہد رکھا گیا اس نے مہمان کے آنے سے پہلے ان چیزوں کو اٹھانا چاہا ابھی روٹی اور مکھن ہی ہٹا پایا تھا کہ مہمان آ گیا، شہد نہیں ہٹا پایا۔ بخیل نے سوچا کہ خالی شہد کیا کھائے گا؟ اس لیے مہمان سے پوچھ لیا: کیا بغیر روٹی کے شہد کھاؤ گے، مہمان نے کہا کیوں نہیں، چنانچہ اس نے شہد چاٹنا شروع کر دیا، بخیل کو بڑی پریشانی ہوئی، اس نے مہمان سے کہا: ''**مهلا يا أخي و الله انه يحرق القلب** ''میرے بھائی ذرا رکو تو سہی، اس طرح شہد کھانا دل کو جلا دیتا ہے تو مہمان نے کہا ''**نعم صدقت و لكن قلبک** ''بات تو تمہاری صحیح ہے؛ لیکن میرا یہ عمل تمہارے ہی دل کو جلا رہا ہے۔(اكرام الضيف موقع فی انترنيت)

ایثار اور مہمان نوازی

احادیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دور دراز سے ایک صاحب تشریف لائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر میں معلوم کرایا کہ ان کی ضیافت کے لیے کچھ ہے یا نہیں جواب آیا کہ کہ یارسول اللہ۔ پانی کے سوا کچھ نہیں۔ دوسری زوجہ مطہرہ کے گھر معلوم کرایا۔ وہاں سے بھی یہی جواب آیا کہ پانی کے سوا کچھ نہیں۔ جب کئی گھروں میں معلوم کرنے کے بعد بھی مہمان کی میزبانی کا کوئی نظم نہ ہوسکا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے درمیان اعلان کروایا کہ کون ہے جو میرے اس مہمان کی ضیافت و میزبانی کرے۔ ایک انصاری صحابی حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ۔ اس خدمت کے لیے غلام حاضر ہے۔ جیسا بھی ہوں آپ کے سامنے ہوں۔ آپ کا مہمان میرا مہمان ہے۔ میں دل نکال کر آپ کے مہمان کے لیے رکھ دوں گا؛ چنانچہ ان کو لے کر وہ گھر تشریف لے گیے۔ بیوی سے کہا کہ میرے ساتھ مہمان ہیں۔ ان کے لیے کھانے کا نظم کرنا ہے۔ بیوی نے جواب دیا کہ گھر میں جو کھانا ہے وہ

زیادہ سے زیادہ بچے کھا سکتے ہیں۔ ہمارے اور آپ کے کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں ہے۔ اب بتایئے کیا کیا جائے۔ تو صحابی نے فرمایا کہ بچوں کو دلاسا اور تسلی دے کے سلا دو اور پھر جو کچھ کھانا ہے وہ مہمان کے سامنے رکھ دو اور گھر کی روشنی اور چراغ گل کر دو؛ اس لیے کہ اگر روشنی رہے گی تو مہمان ہم سے بھی کھانے کا اصرار کریں گے آپ بھی ہمارے ساتھ شریک ہوں؛ لیکن اگر ہم شریک ہو جائیں گے تو مہمان کا پیٹ نہیں بھر پائے گا اور ہر حال میں مہمان کا پیٹ بھرنا چاہیے۔ وہ بیوی بھی مومنہ تھی۔ وہی جذبہ ان کے دل میں بھی تھا جو شوہر کے دل میں۔ بچوں کو ماں باپ نے سلا دیا۔ اور کھانا مہمان کے لیے دستر خوان پر رکھ دیا اور چراغ کو گل کر دیا گیا اور پیٹ بھر کھانا مہمان کو کھلا دیا گیا۔ مہمان واپس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف لے گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی ساری کی ساری چیزیں بتا دی گئی کہ آپ کے فدا کار نے آپ کے مہمان کے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے کہ خود بھوکے رہے بچوں کو بھوکہ سلا دیا اور مہمان کی میز بانی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ جب صبح کو ابوطلحہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دیکھتے ہی بشاشت و مسرت کے جذبات سے لبریز ہو گئے۔ آپ کے چہرے پر تبسم کے آثار ظاہر ہوئے اور فرمایا ''**قد عجب اللہ من صنیعکما بضیفکما اللیلة**'' (بخاری و مسلم) فرمایا کہ ابوطلحہ! اللہ رب العزت والجلال نے تمہارے اور تمہاری بیوی کے رویہ کو بہت پسند کیا جو تم نے مہمانوں کے ساتھ رات کیا۔ اور پھر قرآن پاک کی آیت کریمہ نازل ہوئی **و یؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصة** کہ صحابہ کرام کی شان یہ ہے کہ یہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں چاہے خود ان کو تنگ دستی کا سامنا کرنا پڑے؛ لیکن اپنی ضرورت کو دوسروں کی ضرورت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اسی کا نام ایثار ہے۔ تو یہی شان صحابۂ کرام کے اندر پیدا ہوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت میں رہ کر، ہر مومن کی یہی شان ہونی چاہیے اور مہمان کی دل کھول کر ضیافت اس کو کرنی چاہیے۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں حضرت علی ابن ابی طالب کے حوالہ سے یہ واقعہ ذکر فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی رو رہے تھے۔ معلوم کیا گیا کہ حضرت کیوں آپ کو رونا آ رہا ہے فرمایا کہ سات دن ایسے گذرے ہیں کہ کوئی مہمان نہیں آیا۔ مجھے رونا اس بات پر آ رہا ہے کہ مجھ سے کوئی گناہ تو نہیں ہو گیا جو اللہ مہمان کو دروازہ پر نہیں بھیج رہے ہیں۔ یہ ہے ایمان کی شان کہ مہمان نہ آنے کی وجہ سے رو رہے ہیں اور اپنے اعمال کا جائزہ لے رہے ہیں۔

اصلاحِ معاشرہ

تصنیف وتالیف کی اہمیت

ازقلم: مولانا محمد اویس صاحب رشادی، استاذ دارالعلوم شاہ ولی اللہ بنگلور

دینِ اسلام کا امتیاز:

اللہ تعالیٰ نے اس جہاں میں انسان کو بسایا، ان کے رشد وہدایت کے واسطے تسلسل کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کرتا رہا؛ چنانچہ: ﴿ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا﴾ (مؤمنون) بعض نبیوں پر آسمانی کتابیں وصحیفے نازل فرمائے، انبیاء علیہم السلام انھیں کی روشنی میں اپنی امت کو ایک اللہ کی طرف دعوت دیتے تھے، معروف کا حکم فرماتے اور منکر وسے منع کرتے تھے؛ چونکہ ہر نبی کی شریعت قابلِ تنسیخ تھی؛ اِس لیے ان انبیاء کی نہ ہی کتاب محفوظ رہی اور نہ ہی محفوظ رکھنے کے اسباب سوچے گئے، سب سے اخیر میں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر روئے زمین پر بسنے والے سارے انسانوں پر خصوصاً ایمان والوں پر بڑا احسان فرمایا؛ چنانچہ: ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا﴾ (آلِ عمران) آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر جو کتاب نازل فرمائی بلاشبہ ساری انسانیت کے لیے اور خصوصاً ایمان والوں کے لیے رشد وہدایت اور رحمتِ خداوندی کو متوجہ کرنے کا مؤثر ذریعہ ہے؛ چنانچہ: ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَاهُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (بنی اسرائیل) اب رہتی دنیا تک آپ ہی کی شریعت باقی رہنے والی ہے، نہ آپ کی شریعت قابلِ تنسیخ ہے اور نہ آپ پر نازل شدہ کتاب قرآن مجید کی کوئی آیت منسوخ ہونے والی ہے، قیامت کی صبح تک یہ کلامِ پاک من وعن محفوظ رہے گا ان شاء اللہ؛ کیوں کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے؛ چنانچہ: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (حجر) اور آپ جو دین دینِ اسلام لے کر آئے وہ دینِ متین بھی کلامِ پاک ہی کی طرح ابدی ہے، اور اللہ کا پسندیدہ مذہب بھی دینِ اسلام ہی کو قرار دیا گیا؛ چنانچہ: ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (آلِ عمران) اسی دینِ اسلام کی پیروی میں کامیابی پنہاں ہے۔

دینِ اسلام کی حفاظت کا بنیادی سبب:

اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام، شریعتِ محمدیہ اور کلامِ پاک کی حفاظت کے بے شمار اسباب دنیا میں پیدا

فرمائے، جس کی وجہ سے اسلام اور قرآن اپنے جملہ خوبیوں کے ساتھ روشن وتاباں ہے، انھیں اسباب میں تصنیف وتالیف ایک بنیادی سبب ہے، حفاظتِ اسلام کے جتنے اسباب ہیں سب ملہم من اللہ ہیں، خدمت تصنیف وتالیف بھی خود اللہ جل شانہٗ کی طرف سے ملا ہوا عظیم عطیہ ہے؛ چنانچہ حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ: قلم اللہ کی بڑی نعمت ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو نہ کوئی دین قائم رہتا نہ دنیا کے کاروبار درست ہوتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو ایسی چیزوں کا علم دیا جن کو وہ نہیں جانتے تھے، ان کو جہل کی اندھیری سے نورِ علم کی طرف نکالا اور علمِ کتابت کی ترغیب دی؛ کیونکہ اس میں بے شمار اور بڑے منافع ہیں جن کا اللہ کے سوا کوئی احاطہ نہیں کرسکتا۔ (معارف القرآن: ج/۸،ص/۸۷۶)

قلم، دوات اور کاغذ:

اسی وجہ سے تصنیف وتالیف کی طرف اللہ تعالیٰ نے بلیغ انداز میں قرآن شریف میں بھی اشارہ دیا، اور اس کے لیے جن تین اشیاء کی ضرورت پڑتی ہے (قلم، دوات اور وہ کاغذ جس پر لکھا جاتا ہے) اِن تینوں کو قرآنِ مجید میں بیان کردیا گیا۔

کاغذ کا تذکرہ سورۂ انعام میں موجود ہے؛ چنانچہ: ﴿وَلَوْنَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِهِمْ﴾ (انعام) نیز ﴿قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَاءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ﴾ (انعام) قرطاس کا مطلب وہ کھال یا کاغذ جس پر لکھا جاتا ہے؛ چنانچہ: **قرطاسٍ هو مايكتب عليه جلداً أوورقًا كالرقّ، وهو الصحيفة، وليس كالخشبة والحجر وإن كان يكتب عليهما.**

سورۂ ''ن'' میں دوات کا اشارہ موجود ہے؛ چنانچہ: ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَايَسْطُرُوْنَ﴾ (سورۂ ن) **عن أبي هريرة رضي الله عنه قال سمعت رسول الله صلّى الله عليه وسلم يقول: خلق الله النون، وهي الدواة.** (تفسیر ابنِ کثیر) **عن ابن عباس قال: إن الله خلق النون وهي الدواة.** (تفسیر ابنِ کثیر) اور اسی سورت میں قلم کی صراحت موجود ہے؛ چنانچہ: ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَايَسْطُرُوْنَ﴾ (ن) آیت میں اگر قلم سے مراد قلم تقدیر لیا جائے جو سب سے پہلی مخلوق ہے اس کی عظمت اور تمام چیزوں پر اس کیا یک برتری ظاہر ہے؛ اِس لیے اس کی قسم کھانا مناسب ہوا اور اگر قلم سے مراد عام قلم لیے جاویں جس میں قلم تقدیر اور فرشتوں کے اقلام کے علاوہ انسانوں کے قلم بھی داخل ہیں تو اس کی قسم اس لیے کھائی گئی کہ دنیا میں بڑے بڑے کام سب قلم ہی سے ہوتے ہیں، ملکوں کی فتوحات میں تلوار سے زیادہ قلم کا مؤثر ہونا منقول ومعروف ہے، ابوحاتم بستیؒ نے اسی مضمون کو دو شعروں میں فرمایا ہے ؎

إذا أقسم الابطال يومًا بسيفهم
وعدوه مما يكسب المجد والكرم
كفٰى قلم الكتاب عزا و رفعة
مدى الدهر إن اللّٰه أقسم بالقلم

ترجمہ: جب کہ بہادر لوگ قسم کھائیں کسی دن اپنی تلوار کی، اور اس کو شمار ان چیزوں میں جو انسان کو عزت وشرف بخشتی ہیں، تو کافی ہے لکھنے والوں کا قلم ان کی عزت و برتری کے لیے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے؛ کیونکہ اللہ نے قسم کھائی ہے قلم کی۔ (معارف القرآن: ج/۸،ص/۵۳۱) یقسم تعالیٰ بالقلم، وهو اسم جنس شامل للأقلام، التي تكتب بها (أنواع) العلوم، ويسطر بها المنثور والمنظوم. (تفسیر السعدی) والقلم أقسم بالقلم لما فيه من البيان كاللسان وهو واقع علىٰ كل قلم ممايكتب به من في السماء ومن في الأرض. (تفسیر قرطبی)

تخلیق انسانی کا مقصد تعلیم:

سورۂ علق میں تخلیق انسانی کے بعد اس کی تعلیم کا بیان ہے؛ چنانچہ: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ○﴾ (علق) کیوں کہ تعلیم ہی وہ چیز ہے جو انسان کو حیوانات سے ممتاز کرتی ہے اور انسان کو اشرف واعلیٰ بناتی ہے، پھر تعلیم کی دو صورتیں ہیں ایک زبانی تعلیم دوسری قلمی تعلیم، ان دونوں شکلوں کو اللہ نے ﴿اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ ○﴾ (علق) کہہ کر بیان فرمایا، اس سے بھی قلمی تعلیم (جس کی بنیاد تصنیف وتالیف پر ہے) کی اہمیت وضرورت پر روشنی پڑتی ہے؛ نیز زبانی تعلیم وتدریس پر قلمی تعلیم (تصنیف وتالیف) کو مقدم فرما کر تصنیف وتالیف کو ایک برتی عطا فرمائی، شاید اسی وجہ سے ابن الجوزیؒ نے لکھا ہے کہ: "إن نفع التصانيف أكثر من نفع التعليم بالمشافة". (صید الخاطر: ص/۳۷۶) کہ تصنیف وتالیف کا شغل درس وتدریس سے زیادہ نفع بخش ہے۔

فن کتابت کی شروعات:

بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ فنِ کتابت سب سے پہلے ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو سکھایا گیا تھا، سب سے پہلے انھوں نے لکھنا شروع کیا۔ (کعب احبار) بعض حضرات نے کہا: سب سے پہلے یہ فن حضرت ادریس علیہ السلام کو ملا ہے، سب سے پہلے کاتبِ دنیا وہی ہیں۔ (ضحاک) اور بعض حضرات نے فرمایا: ہر شخص جو کتابت

کرتا ہے وہ تعلیم من جانب اللہ ہی ہے۔(معارف القرآن: ج/۸،ص/۷۸۵)ابتدائے اسلام سے لے کر آج تک جس قدر کتابیں لکھی گئیں اس کی مثال دوسری قومیں دے نہیں سکتیں، علمائے سلف وخلف نے ہمیشہ تعلیم خط وکتابت کا اہتمام کیا جس پر ان کی تصانیف کے عظیم الشان ذخائر آج تک شاہد ہیں۔

ہمیشہ باقی رہنے والی اولاد:

یہ بات سب جانتے ہیں کہ موت پر سارے اعمال منقطع ہوجاتے ہیں، نہ نماز پڑھ سکتی ہے نہ کوئی کلمۂ خیر کہہ کر ثواب کا مستحق ہوسکتا ہے، نہ فرض وواجب ادا کرسکتا ہے، موت پر اعمال منقطع اور ثواب کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے، ایصالِ ثواب کے راستے سے عزیز واقارب کے تحائف کا شدت سے منتظر رہتا ہے، حدیثِ پاک کے مطابق وہ لوگ خوش نصیب ہیں جن کا عمل اور اس کا ثواب موت پر بھی منقطع نہیں ہوتا؛ چنانچہ:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِذَا مَاتَ ابْنُ آدَمَ اِنْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ: صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْعِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْوَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْ لَهُ. (مسلم)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جب انسان مرتا ہے تو اس کے اعمال منقطع ہوجاتے ہیں سوائے تین اعمال کے: صدقۂ جاریہ یا وہ علم جس سے لوگ منتفع ہوتے ہیں یا وہ اولاد جو اس کے حق میں دعا کرتی ہے''۔

عالم کا علم اور اس کی دینی خدمات کا ثواب موت پر بھی ختم نہیں ہوتا، نیک اولاد کی دعائیں بھی اللہ قبول کرتا ہے؛ لیکن اولاد کی عمریں بھی تو محدود ہیں، ان کی موت پر یہ سلسلہ ختم ہو ہی جائے گا؛ مگر ایک عالم تصنیف وتالیف کے راستے سے جو خدمات انجام دیتا ہے یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہوتا ہے؛ بلکہ ایک عالم کی حقیقی اولاد اس کی تصنیفات ہی ہیں، قیامت کی صبح تک اس کو بقا حاصل ہوتا ہے بقول علامہ ابن الجوزیؒ:''**فإن تصنيف العالم ولده المخلد**''. (صیدالخاطر:ص/۵۳) یعنی عالم کی تصنیف اس کی ہمیشہ باقی رہنے والی اولاد ہے۔**قال الخطيب البغدادي: يثبت الحفظ ويذكي القلب ويشحذ الطبع ويجيد البيان ويكسب جميل الذكر وجزيل الأجر ويخلده إلىٰ آخر الدهر.** (تذكرة السامع والمتكلم في أدب العالم والمتعلّم) اس قدر اس کی اہمیت ہونے ہی کی وجہ سے امام طبرانیؒ اپنی کتاب ''المعجم الاوسط'' کے متعلق فرماتے تھے:''**هٰذا الكتاب روحي**'' یعنی یہ کتاب میری روح ہے، حافظ ذہبیؒ ان کے اس قول کو نقل کرنے کے بعد اس کا سبب ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:''**فإنه تعب عليه**'' یعنی ''اسے تیار کرنے میں انھوں نے کافی محنتیں کی ہیں، اسے اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے''۔

اہلِ قلم کے لیے رہنما خطوط:

جب تصنیف وتالیف اس قدر نفع بخش ہے تو اہلِ علم کو چاہیے کہ وہ اس کو اپنا مشغلہ بنائیں، اہلِ قلم اور میدانِ تصنیف وتالیف کے شہسواروں کی خدمت میں اس ناچیز کی چند گزارشات ہیں:

(۱) اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ اپنے قلم کو جنبش دیں، ہر تحریر اور تحری کا ہر صفحہ وسطر لوجہ اللہ ہو، نام ونمود اور تصنیف سے شہرت مقصد نہ ہو، اسلاف کی تحریرات ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی آج تک زندہ وتابندہ ہونے کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ انھوں نے اشاعتِ دین کو پیشِ نظر رکھ کر محض اللہ کو راضی کرنے کے لیے متون وشروحات لکھا، قرآنِ مجید کی کئی جلدوں میں تفسیر لکھ کر قیامت تک آنے والی نسل کے لیے ہدایت کے چراغ روشن کر دیے، حدیث وسنت کی بے غبار تشریح لکھ کر امت پر عظیم احسان کیا، سیرتِ پاک پر روشنی ڈالتے ہوئے سینکڑوں صفحات سیاہ کر دیے، فقہی اُصول وفروعات پر سیر حاصل بحثیں دفاتر میں جمع کر کے امت کو بے نیاز کر دیا، علماءِ متقدمین ومتاخرین میں کئی قدسی اشخاص ایسے بھی گزرے ہیں جن کی ایک اکیلی تصنیف بھی اپنی جگہ انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتی ہے۔ اُولٰئِکَ آبَائِي فَجِئْنِي بِمِثْلِهِمْ

بہت سارے ائمہ نے اپنی کتابوں کا آغاز حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث "إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" (بخاری شریف) سے کیا ہے، انہی میں سے ایک امام بخاری بھی ہیں، ابنِ مہدی الحافظؒ نے یہاں تک کہہ دیا کہ جو کتاب لکھنا چاہے وہ اس حدیث سے کتاب کی شروعات کرے؛ چنانچہ: "**وقال ابن مهدي الحافظ من أراد أن يصنف كتابًا فليبدأ بهٰذا الحديث**". (عمدۃ القاری للعینی: ج/۱)

علامہ کرمانیؒ شرح بخاری کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: "**وماتوسلت به إلٰى غرض دنيوي، من مال، أو جاه، بل جعلته للّٰه ولوجهه خالصًا**". امام کرمانیؒ شارح بخاری نے "صحیح بخاری" کے متعلق لکھا ہے: "**لما صحّح فيه النية، وصفّى فيه الطوية، جعل اللّٰه تعالٰى كتابه علما من أعلام الإسلام.** (كلياتِ شرعية عامة في سنن أبي داؤد)". علامہ عینیؒ نے کہا ہے: "**أعطى هٰذا الكتاب من الحظ مالم يعط غيره من كتب الإسلام وقبله أهل المشرق والمغرب**". (عمدۃ القاری للعینی: ج/۱)

امام شاطبیؒ لکھتے ہیں: "**لايقرأ قصيدتي هٰذه أحد إلا نفع اللّٰه بها، لـ.ني نظمتها للّٰه تعالٰى** (ترجمة الشاطبي للشيخ علي محمد الضَّباع)". اللہ تعالیٰ نے ان کے اخلاص ہی کی وجہ سے ان کی کتابوں کو قبولِ عام عطا فرمایا ہے۔

امام نوویؒ نے شیخ ابو اسحاق شافعیؒ کی تصانیف کے متعلق لکھا ہے: "**انتشرت تصانيفه شرقًا وغربًا لبركة إخلاصه**". (المجموع شرح المهذب)

(۲) مقالہ نگاری ومضمون نگاری اورتصنیف وتالیف میں مقاصدِ شریعت اور روحِ دین کوملحوظ رکھیں، اشاعتِ دین اورترویجِ احکامِ شرعیہ کومقصد بنائیں۔

(۳) سارامواد ومسالہ عامۃ المسلمین کی ضروریاتِ دین سے متعلق ہو۔اسلاف کی تحریریں مقبولِ عام وتام ہونے کا بنیادی سبب یہی ہے کہ انھوں نے زمانے کے نبض پر ہاتھ رکھااوراس وقت کی بیماریوں کا علاج ونسخہ تجویز کیا،جس کے نتیجہ میں وہ امت کے مسیحا بن گئے۔

(۴) مضمون کا انشا پیچیدہ نہ ہو؛ بلکہ عام فہم ہو، پڑھنے والے اس سے دین وشریعت،اخلاق وکردار،سنت وسیرت کا سبق لیں،محض وقت گزاری کا وہ ذریعہ نہ ہو۔

(۵) اگرتحریراصلاحی مضامین پرمشتمل ہوتوسب سے پہلے اپنی اصلاح مقصد ہواور پھر عامۃ المسلمین سے خیرخواہانہ انداز میں مخاطب ہوں،اس کے لیے ''اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ'' (بخاری شریف) ہمیشہ ملحوظِ خاطر رہے۔اور اگرتحقیقی مقالات پرمشتمل ہوتوہر بات مدلل ومستند ہو۔

(۶) تحریر کے ذریعہ کسی پرطنز وتشنیع کومقصد نہ بنایا جائے؛ کیوں کہ اختلافات ختم ہوسکتے ہیں،ختم نہ بھی ہوں یقیناً موت پر ہمارا ہی وجود ختم ہوجائے گا؛مگر وہ طنزیہ فقرے، غیرشرعی اعتراضات اوراق کے سینوں میں محفوظ رہ جائیں گے،اس کی تلافی کی کوئی شکل باقی نہیں رہے گی۔

(۷) اللہ کی توفیق سے کسی کتاب کی تصنیف وتالیف کا موقع میسر ہو، پورے انہماک کے ساتھ اس کو اپنا مشغلہ بنائیں اورمواد کے حصول میں کتب خانہ کھنگالیں،اس کی تکمیل کے بعد اشاعت میں جلد بازی سے کام نہ لیں؛ بلکہ اپنے زمانے کے خداترس اکابر ومشائخ کی خدمت میں اپنی کاوش کوپیش کرکے تصویب کرالیں اور ان سے تائیدی کلمات حاصل کرلیں، یہ طرز زمانۂ قدیم سے چلا آرہا ہے؛ چنانچہ امام مالکؒ نے مؤطا کی تصنیف سے فراغت کے بعد اس کی اشاعتِ عام سے پہلے علماءِ مدینہ کی تائید حاصل کرنے کی غرض سے اپنی کتاب کوان کے سامنے پیش کیا،سب نے اس کی تحسین کی،علامہ زرقانی اس کو یوں لکھتے ہیں:''**وروي أبو الحسن بن فهر عن علي بن أحمد الخلنجي: سمعت بعض المشايخ يقول: قال مالک: عرضت كتابي علىٰ سبعين فقيها من فقهاء المدينة، فكلهم وأطاني، فسميته الموطا**''. (مرقانی:ج۱،ص۶۲)

امام بخاریؒ کی بےنظیرولاجواب کتاب''**الجامع المسند الصحيح المختصر من أمور رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم وسننه وأيامه المعروف بـ ''صحيح البخاري**'' جب تکمیل کوپہنچی تو انھوں نے اس کومشاہیر پرپیش کیا،جس میں امام احمد بن حنبلؒ، یحییٰ بن معین،علی بن المدینی رحمہم اللہ جیسی نابغۂ

روزگار اور علمی شخصیات شامل ہیں؛ چنانچہ سب نے اس کو اچھا جانا؛ مگر چار روایتوں پر عدمِ اعتماد کا اظہار کیا۔ حافظ صاحبؒ اس کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"لما ألف البخاري كتاب الصحيح عرضه علىٰ أحمد بن حنبل ويحيىٰ بن معين وعلي بن المديني وغيرهم فاستحسنوه وشهدوا له بالصحة إلا في أربعة أحاديث". (الهدي الساري: ص/٩)

یہ رہنما خطوط ہمارے اسلاف کی تحریروں میں ملتی ہیں، ان کو ہم اپنی تحریروں میں جگہ دیں پھر دیکھیں کہ ہماری تحریروں میں کس قدر جاذبیت پیدا ہوتی ہے، اور ان کو عنداللہ قبولیت حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے، آمین

وَمَاعَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ

❑❖❑

اصلاحِ معاشرہ (قسط اوّل)

کیا نصوح کی توبہ کا واقعہ صحیح ہے؟

از: مفتی احمد اللہ نثار صاحب قاسمی، ناظم دار العلوم رشیدیہ وصدر دار الافتاء والارشاد حیدرآباد

واقعہ

نصوح ایک عورت نما آدمی تھا، باریک آواز، بغیر داڑھی اور نازک اندام مرد، وہ اپنی ظاہری شکل وصورت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے زنانہ حمام میں عورتوں کا مساج کرتا اور میل اُتارتا تھا، کوئی بھی اس کی حقیقت نہیں جانتا تھا، سب ہی اسے عورت سمجھتے تھے، یہ طریقہ اس کے لیے ذریعۂ معاش تھا اور عورتوں کے جسم سے لذت بھی لیتا تھا، کئی بار ضمیر کے ملامت کرنے پر اس نے اس کام سے توبہ بھی کر لی؛ لیکن ہمیشہ توبہ توڑتا رہا۔

ایک دن بادشاہ کی بیٹی حمام گئی، حمام اور مساج کرنے کے بعد پتہ چلا کہ اس کا گراں بہا گوہر (موتی یا ہیرا) کھو گیا ہے، بادشاہ کی بیٹی نے حکم دیا کہ سب کی تلاشی لی جائے، سب کی تلاشی لی گئی؛ مگر ہیرا نہیں ملا، نصوح رُسوائی کے ڈر سے ایک جگہ چھپ گیا، جب اس نے دیکھا کہ شہزادی کی کنیزیں اسے ڈھونڈ رہی ہیں تو اس نے سچے دل سے خدا کو پکارا اور خدا کی بارگاہ میں دل سے توبہ کی اور وعدہ کیا کہ آئندہ کبھی بھی یہ کام نہیں کروں گا میری لاج رکھ لے مولا! وہ دعا مانگ ہی رہا تھا کہ اچانک باہر سے آواز سنائی دی کہ نصوح کو چھوڑ دو، ہیرا مل گیا ہے، نصوح نَم آنکھوں سے شہزادی سے رخصت لے کر گھر آ گیا، نصوح نے قدرت کا کرشمہ دیکھ لیا تھا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کام سے توبہ کر لی۔

کئی دنوں سے حمام نہ جانے پر ایک دن شہزادی نے بلاوا بھیجا کہ حمام آ کر میرا مساج کرے؛ لیکن نصوح نے بہانہ بنایا کہ میرے ہاتھ میں درد ہے میں مساج نہیں کر سکتا ہوں، نصوح نے دیکھا کہ اب اس شہر میں رہنا اس کے لیے مناسب نہیں ہے، سب ہی عورتیں اس کو چاہتی ہیں اور اس کے ہاتھ سے مساج لینا پسند کرتی ہیں، جتنا بھی غلط طریقے سے مال کمایا تھا سب غریبوں میں بانٹ دیا اور شہر سے نکل کر کئی میل دُور ایک پہاڑی پر ڈیرہ ڈال کر اللہ کی عبادت میں مشغول ہو گیا، ایک دن اس کی نظر ایک بھینس پر پڑی جو اس کے قریب گھاس چر رہی تھی، اس نے سوچا کہ یہ کسی چرواہے سے بھاگ کر یہاں آ گئی ہے جب تک اس کا مالک نہ آ جائے تب تک میں

اس کی دیکھ بھال کرلیتا ہوں؛ لہٰذا اس کی دیکھ بھال کرنے لگا، کچھ دن بعد ایک تجارتی قافلہ راستہ بھول کر ادھر آ گیا جو سارے پیاس کی شدت سے نڈھال تھے، انھوں نے نصوح سے پانی مانگا، نصوح نے سب کو بھینس کا دودھ پلایا اور سب کو سیراب کر دیا، قافلے والوں نے نصوح سے شہر جانے کا راستہ پوچھا، نصوح نے ان کو آسان اور نزدیکی راستہ دکھایا، نصوح کے اخلاق سے متأثر ہوکر تاجروں نے جاتے ہوئے اسے بہت سارا مال بطور تحفہ دیا، نصوح نے ان پیسوں سے وہاں کنواں کھدوایا، آہستہ آہستہ وہاں لوگ بسنے لگے اور عمارتیں بننے لگیں، وہاں کے لوگ نصوح کو بڑی عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے، رفتہ رفتہ نصوح کی نیکی کے چرچے بادشاہ تک جا پہنچے، بادشاہ کے دل میں نصوح سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا، اس نے نصوح کو پیغام بھیجا کہ بادشاہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں، مہربانی کرکے دربار تشریف لے آئیں، جب نصوح کو بادشاہ کا پیغام ملا تو اس نے ملنے سے انکار کر دیا اور معذرت چاہی کہ مجھے بہت سارے کام ہیں میں نہیں آ سکتا۔ بادشاہ کو بہت تعجب ہوا؛ مگر اس بے نیازی کو دیکھ کر ملنے کی طلب اور بڑھ گئی، بادشاہ نے کہا کہ اگر نصوح نہیں آسکتے تو ہم خود اس کے پاس جائیں گے، جب بادشاہ نصوح کے علاقے میں داخل ہوا، خدا کی طرف سے ملک الموت کو حکم ہوا کہ بادشاہ کی روح قبض کرلے؛ چونکہ بادشاہ بطور عقیدت مند نصوح کو ملنے آرہا تھا اور رعایا بھی نصوح کی خوبیوں کی گرویدہ تھی؛ اِس لیے نصوح کو بادشاہ کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔

نصوح نے اپنے ملک میں عدل اور انصاف کا نظام قائم کیا، وہی شہزادی جسے عورت کا بھیس بدل کر ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈرتا تھا، اس شہزادی نے نصوح سے شادی کرلی۔

ایک دن نصوح دربار میں بیٹھا لوگوں کی دادرسی کررہا تھا کہ ایک شخص وارد ہوا اور کہنے لگا کہ کچھ سال پہلے میری بھینس گم ہوگئی تھی، بہت ڈھونڈا؛ مگر نہیں ملی، برائے مہربانی میری مدد فرمائیں؟ نصوح نے کہا کہ تمہاری بھینس میرے پاس ہے، آج جو کچھ میرے پاس ہے وہ تمہاری بھینس کی وجہ سے ہے، نصوح نے حکم دیا کہ اس کے سارے مال اور دولت کا آدھا حصہ بھینس کے مالک کو دیا جائے، وہ شخص خدا کے حکم سے کہنے لگا: اے نصوح! جان لو، نہ میں انسان ہوں اور نہ ہی وہ جانور بھینس ہے؛ بلکہ ہم دو فرشتے ہیں جو تمہارے امتحان کے لیے آئے تھے، یہ سارا مال اور دولت تمہارے سچے دل سے توبہ کرنے کا نتیجہ ہے، یہ سب کچھ تمہیں معاف ہو، یہ کہہ کر وہ دونوں فرشتے نظروں سے غائب ہوگئے، اسی وجہ سے سچے دل سے توبہ کرنے کو (توبۂ نصوح) کہتے ہیں، تاریخ کی کتب میں نصوح کو بنی اسرائیل کے ایک بڑے عابد کی حیثیت سے لکھا گیا ہے۔

(مثنوی معنوی، دفتر پنجم، انوار المجالس: ۴۳۲)

حکم: مذکورہ واقعہ کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے یا ''آیتِ توبہ'' کی تفسیر کا حصہ شمار کرکے یا ترغیب کے لیے بھی بیان کرنا درست نہیں ہے۔

وجہ: (۱) قطبِ عالم فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ اسی سوال کے جواب میں لکھتے ہیں کہ: ''آیت کی تفسیر میں توبۂ نصوح کے معنیٰ ''نصوح کے توبہ کرنا'' اور نصوح کسی شخص کا نام مقرر کرنا محض جہل وحماقت ہے، ترجمہ یہ ہے کہ ''توبہ خالص کرو'' توبہ موصوف اور نصوح اس کی صفت ہے اور یہ ترجمہ جہال کا، توبہ نصوح کی باضافت ہے، پس ایسی تفسیر کرنا اوّلاً جہل ہے، دوسرے تفسیر بالرائے ہے، ایسا شخص ہرگز قابلِ وعظ نہیں اور قصہ جس نصوح کا لوگوں میں زبان زَد ہے وہ نزولِ قرآن شریف سے مدتوں پہلے پیدا ہوا ہے، الغرض یہ مفسّر بالکل احمق ہے اور یہ تفسیر اس کی بالکل غلط ہے''، فقہ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(باقیاتِ فتاویٰ رشیدیہ: توبۂ نصوح کا مفہوم کیا ہے؟ ص ۴۱۴/، دار الکتاب لاہور)

(۲) مفتی عبد الباقی اخونزادہ صاحب دامت برکاتہم تنبیہات میں فرماتے ہیں کہ: ''سوال میں مذکور واقعہ باوجود تلاشِ بسیار کے ہمیں کسی بھی مستند کتاب میں نہ مل سکا..... سوال میں مذکور واقعہ ایک خود ساختہ اور من گھڑت قصہ ہے؛ لہٰذا اس کو بیان کرنا اور پھیلانا درست نہیں''۔ (تنبیہات، سلسلہ نمبر: ۹۲۹)

لغۃً: لغت میں توبہ لوٹنے اور رجوع کرنے کو کہتے ہیں، علامہ رازیؒ نے ''مختار الصحاح'' (ص/۵۹) میں اور علامہ فیروز آبادیؒ نے ''القاموس المحیط'' (ص/۵۹) میں لکھا ہے: ''تاب إلی اللّٰہ'' اور ''توبۃ'' گناہ اور معصیت سے لوٹنے کو کہا جاتا ہے، شریعت میں اللہ کی معصیت ونافرمانی کو ترک کرکے اس کی اطاعت اختیار کرنے کو توبہ کہتے ہیں۔

(۱) ''نصوح'' فعول کے وزن پر مبالغہ کے معنیٰ میں ہے، اس کا معنیٰ ''خیر خواہی اور بھلائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ہے''، یہ لفظ ''النصیحۃ'' سے ماخوذ ہے، نصیحت کے معنیٰ دوسروں کے ساتھ خیر خواہی اور عمدہ طرزِ فکر کے ہیں، جب کہتے ہیں: ''الدین النصیحۃ'' تو مراد ''دوسروں کی بھلائی چاہنا''۔

(۲) ''نَصُوحُ'' عام اسم: بالکل خالص، بے غل وغش۔ نَصَحَ الشَّيْءُ نَصْحًا وَنُصُوْحًا وَنَصَاحَةً 'عام فعل'' خالص ہونا، بے غل وغش ہونا۔ خالص شہد کو ''عَسل ناصح'' کہتے ہیں جس کو موم اور دوسری آلائشوں سے پاک کردیا گیا ہو، پھٹے ہوئے کپڑے کو سی دینے اور اُدھڑے ہوئے کپڑے کو مرمّت کردینے کے لیے ''نَصَاحة الثَّوْب'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، اس لحاظ سے توبہ کو ''نَصوح'' کہنے کا مطلب لغت کے اعتبار سے یا تو یہ ہوگا کہ:

۱- ایسی خالص توبہ جو ریاء اور نفاق کے شائبہ سے پاک رہے۔

۲-اپنے نفس کے ساتھ خیر خواہی کرتے ہوئے ایسی توبہ کرے کہ اپنے آپ کو بُرے انجام سے بچالے۔
۳-گناہ کی وجہ سے اس کے دین میں جو شگاف پڑ گیا ہے توبہ کے ذریعہ سے اس کو درست کرلے۔
۴-گو بہ کرکے وہ اپنی زندگی کو اتنا سنوار لے کہ دوسروں کے لیے وہ نصیحت کا موجب ہو اور اس کی مثال کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اُس کی طرح اپنی اصلاح کرلیں۔ بہرحال کامل توبہ مراد ہے نہ کہ نصوح نامی شخص کی توبہ؛ چنانچہ لغوی معنیٰ کا لحاظ کرتے ہوئے مفسرین نے یہی تفسیر لکھی ہے:

(۱)''نصوحاً''النصح سے ماخوذ ہے، عربی میں سلائی کرنے کو کہتے ہیں، گویا توبہ گناہوں کی پھٹن کو رَفو کرکے ایسے ختم کردیتی ہے جیسا کہ درزی اور رفوگر کسی پھٹے ہوئے کپڑے کو سلائی ورفو کرکے اس کی پھٹن کو بالکل ختم کردیتا ہے۔توبۂ نصوح کو سچی، خالص اور محکم و پختہ توبہ بھی کہا جاتا ہے۔''نَصُوْحًا''کو نون کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے، ایسی توبہ کو کہا جاتا ہے کہ جس سے آدمی نصیحت حاصل کرے۔ (تفسیر السمعانی:۵/۴۷۷)

(۲)امام فراءؒ فرماتے ہیں کہ آیت میں ''نصوحًا''توبہ کی صفت ہے، معنیٰ یہ ہے کہ وہ توبہ اپنے کرنے والے کو اس بات کی فہمائش کرے کہ ان گناہوں کی طرف لوٹنے کو ترک کرے جن سے اس نے توبہ کی ہے، اور وہ ایسی سچی اور نصیحت آمیز توبہ ہے کہ کرنے والے اپنے نفس کو گناہوں کی گندگی سے پاک کرتے ہیں۔
(تفسیر الرازی، سورۃ التحریم:۱/۴۴۹۰)

(۳)امام قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ اصل توبۂ نصوح خالص ہونا ہے، ملاوٹ سے پاک شہد کو''عسل ناصح'' کہتے ہیں۔بعض نے کہا کہ یہ''نصاحۃ''بمعنیٰ سلائی سے ماخوذ ہے، اس سے اخذ کی دو وجہیں ہیں:۱-اس توبہ نے اس کی اطاعتِ الٰہی کو محکم و پختہ کیا ہے، جیسا کہ درزی سلائی سے کپڑے کو محکم و پختہ کردیتا ہے،۲-اس توبہ نے اس اللہ کے اولیاء کے ساتھ جوڑا، جمع کیا اور ملایا ہے جیسا کہ درزی سلائی کے ذریعہ کپڑے کے مختلف حصوں کو آپس میں ملاتا اور جوڑ دیتا ہے۔ (تفسیر القرطبی:۱۸/۱۹۹)

''توبۃ النصوح'' کی مستند تفسیر:

(۱) حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے سوال پر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: توبۂ نصوح یہ ہے کہ بندہ اپنے کیے ہوئے گناہ سے نادم ہوکر اللہ کی طرف یوں بھاگے کہ دوبارہ اس کی طرف نہ لوٹے، یہاں تک کہ دودھ تھنوں میں واپس جائے۔''**قال معاذ بن جبل: یارسول اللہ! ما التوبة النصوح؟ ''قال: أن یتوب التائب، ثم لایرجع في ذنب، کما لایعود اللبن إلی الضرع**''. (الدرالمنثور:۶/۲۸۴)

(۲) حضرت عمر، اُبی بن کعب اور معاذ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: توبۂ نصوح یہ ہے کہ وہ توبہ کرے اور پھر

اس گناہ کی طرف دوبارہ نہ لوٹے، جس طرح دودھ تھنوں میں لوٹ کر واپس نہیں جاتا۔ ''**التوبة النصوح أن يتوب ثم لايعود إلى الذنب كما لايعود اللبن إلى الضرع**''. (تفسیر القرطبی، سورۃ التحریم: ۱۸/۱۹۷)

(۳) حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ توبۂ نصوح یہ ہے کہ بندہ اپنی سابقہ گناہ آلود زندگی پر نادم ہو، دوبارہ اس کی طرف نہ لوٹنے کے عزم کے ساتھ۔

(۴) سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''نصوح'' مقبول توبہ کو کہتے ہیں اور توبہ اس وقت تک قبول نہیں کی جاتی ہے جب تک اس میں تین چیزیں نہ پائی جائیں: ۱- عدمِ قبولیت کا خوف ۲- قبولیت کی اُمید ہو ۳- طاعات پر ثابت قدمی ہو''۔ ''**هي التوبة المقبولة؛ ولاتقبل مالم يكن فيها ثلاثة شروط: خوف ألا تقبل، ورجاء أن تقبل، وإدمان الطاعات**''.

(۵) محمد بن سعید قرظیؒ کہتے ہیں کہ: توبۂ نصوح چار چیزوں کے پائے جانے کا نام ہے: ۱- زبان سے استغفار کرنا ۲- بدن سے گناہوں کو اکھیڑ پھینکنا ۳- دل سے دوبارہ لوٹنے کے ترک کا اظہار کرنا ۴- بُرے دوستوں کی صحبت سے دُوری اختیار کرنا ''**يجمعها أربعة .شياء: الاستغفار باللسان، وإقلاع بالأبدان، وإضمار ترك العود بالجنان، ومهاجرة سيء الخلان**. (تفسیر الخازن: ۷/۱۲۲)

(۶) حضرت کلبیؒ نے کہا کہ: توبۂ نصوح یہ ہے کہ زبان سے استغفار کرے، دل سے ندامت اختیار کرے اور اپنے بدن کو قابو میں رکھے۔ ''**التوبة النصوح الندم بالقلب، والاستغفار باللسان، والإقلاع عن الذنب، والإطمئنان على أنه لايعود**''. (تفسیر الخازن: ۷/۱۲۱)

(۷) امام رازیؒ نے اپنی کتاب ''تفسیر کبیر'' میں امام فراء رحمہ اللہ کا نقل کیا ہے، امام فراءؒ فرماتے ہیں کہ آیت میں ''نصوحا'' توبہ کی صفت ہے، معنیٰ یہ ہے کہ وہ توبہ اپنے کرنے والے کو اس بات کی فہمائش کرے کہ ان گناہوں کی طرف لوٹنے کو ترک کرے جن سے اس نے توبہ کی ہے، اور وہ ایسی سچی اور نصیحت آمیز توبہ ہے کہ کرنے والے اپنے نفس کو گناہوں کی گندگی سے پاک کرتے ہیں۔ (تفسیر الرازی، سورۃ التحریم: ۱/۴۴۹۰)

(۸) سفیان ثوریؒ نے فرمایا کہ چار چیزیں توبۂ نصوح کی علامت ہیں: ۱- ''**القلّة**'' یعنی گناہوں کو زائل کرنا ۲- ''**العلّة**'' یعنی اللہ کی یاد سے دل بہلانا یا تشویش میں مبتلا ہونا یعنی نادم ہونا ۳- ''**الذلّة**'' یعنی انکساری اور تابعداری اختیار کرنا ۴- ''**الغربة**'' یعنی گناہوں سے دُوری وجدائی اختیار کرنا۔

(۹) ابوبکر واسطیؒ نے فرمایا: توبۂ نصوح (خالص) توبہ کا نام ہے نہ کہ عقد معاوضہ کا؛ اِس لیے کہ جس نے دنیا میں گناہ کیا اپنے نفس کی سہولت اور مفاد کی خاطر اور پھر توبہ کی اسی نفس کی سہولت کے پیشِ نظر تو اس کی توبہ

اپنے نفس کے لیے ہوگی نہ کہ اللہ کے لیے۔ ''هي توبة لالفقد عوض؛ لأن من أذنب في الدنيا لرفاهية نفسه ثم تاب طلبا لرفاهيتها في الآخرة؛ فتوبته علٰى حفظ نفسه لا للّٰه''. (تفسیر الثعلبی:۳۵۰/۹)

(۱۰) ابوبکر مصریؒ نے فرمایا: توبۂ نصوح مظالم کے لوٹانے یعنی حقوق والوں کے حقوق ادا کرنا، دعویداروں سے حقوق معاف کروانا اور طاعات پر مداومت کرنے کو کہتے ہیں۔ ''التوبة النصوح هي رد المظالم، واستحلال الخصوم، وإدمان الطاعات''.

(۱۱) شقیق بلخیؒ نے کہا کہ: توبۂ نصوح کرنے والا بکثرت اپنے نفس پر ملامت کرے اور ندامت اس سے کبھی جدا نہ ہو؛ تاکہ وہ گناہوں کی آفتوں سے سلامتی کے ساتھ نجات پا سکے۔

(۱۲) سری سقطیؒ نے کہا کہ: توبۂ نصوح ایمان والوں کو اصلاحِ نفس کی فہمائش کیے بغیر نہیں ہوسکتی؛ اِس لیے کہ جس کی توبہ درست قرار پائی تو وہ اس بات کو پسند کرے گا کہ سب لوگ اس کی طرح توبۂ نصوح کرنے والے ہوں۔ ''لاتصلح التوبة النصوح إلا بنصيحة النفس والمؤمنين؛ لأن من صحت توبته أحب أن يكون الناس مثله''. (تفسیر الثعلبی:۳۵۰/۹)

(۱۳) جنید بغدادیؒ نے فرمایا: توبۂ نصوح یہ ہے کہ وہ گناہوں کو ایسے بھول جائے کہ پھر ان کا تذکرہ بھی نہ کرے؛ کیوں کہ جس کی توبہ درست قرار پاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والا بن جاتا ہے اور جس نے اللہ تعالیٰ سے محبت کی وہ اللہ کے ماسوا کو بھول گیا۔ ''التوبة النصوح هو أن ينسي الذنب فلا يذكره أبدا؛ لأن من صحت توبته صار محبا للّٰه، ومن أحب اللّٰه نسي ما دون اللّٰه''.

(۱۴) سہل بن عبداللہ تستریؒ نے فرمایا: توبۂ نصوح اہلِ سنت والجماعت کی توبہ کا نام ہے؛ اِس لیے کہ بدعتی کی کوئی توبہ نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی وجہ سے کہ اللہ نے ہر صاحبِ بدعت کو توبہ کرنے سے محجوب کر دیا ہے۔ ''هي التوبة لأهل السنة والجماعة؛ لأن المبتدع لاتوبة له؛ بدليل قوله صلّى اللّٰه عليه وسلم: حجب اللّٰه علٰى كل صاحب بدعة أن يتوب''.

(۱۵) شیخ فتح موصلیؒ کہتے ہیں کہ: اس کی تین علامتیں ہیں: ۱-نفسانی خواہشات کی مخالفت کرنا ۲-بکثرت رونا ۳-بھوک اور پیاس کی مشقت کو برداشت کرنا، یعنی قلتِ طعام وشراب۔ ''علامتها ثلاث: مخالفة الهوىٰ، وكثرة البكاء، ومكابدة الجوع والظمأ''. (الکشف والبیان:۳۵۱/۹)

(۱۶) حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: توبۂ نصوح یہ ہے کہ تُو گناہ سے ویسے ہی نفرت کرے جیسے تُو نے اس سے محبت کی اور جب تجھے یاد آئے تو اس سے توبہ واستغفار کر۔ (تفسیر ابنِ کثیر:۱۶۸/۸)

(۱۷) ابوبکر وراقؒ نے کہا: توبۂ نصوح یہ ہے کہ زمین اپنی وسعتوں کے باوجود تم پر تنگ ہوجائے، جیسا کہ غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں نے توبہ کی تھی۔ ''هو أن تضيق عليك الأرض بما رحبت، وتضيق عليك نفسك؛ كالثلاثة الذين خلفوا''. (تفسیر القرطبي:۸/۲۸۷)

(۱۸) ابوعبداللہؒ کہتے ہیں کہ: دس چیزوں کا نام توبۂ نصوح ہے:۱-جہل سے نکلنا ۲-اپنے فعل پر نادم ہونا ۳-خواہشات سے دُوری اختیار کرنا ۴-سوال کیے جانے والے نفس کی پکڑ کا یقین ۵-ناجائز معاملات کی تلافی کرنا ۶-ٹوٹے ہوئے رشتوں کا جوڑنا ۷-جھوٹ کو ساقط کرنا ۸-بُرے دوست کو چھوڑنا ۹-معصیت سے خلوت اختیار کرنا ۱۰-غفلت کے طریق سے عدول کرنا۔ (حقائق التفسیر للسلمی:۲/۳۳۷)

(۹۹ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں کہ: توبۂ نصوح سے مراد صاف دل کی توبہ ہے، وہ یہ ہے کہ دل میں پھر اس گناہ کا خیال نہ رہے، اگر توبہ کے بعد انہی خرافات کا خیال پھر آیا تو سمجھو کہ توبہ میں کچھ کسر رہ گئی ہے اور گناہ کی جڑ دل سے نہیں نکلی۔ ''رزقنا الله منها حطًا وافراً بفضله وعونه وهو علىٰ كل شيءٍ قدير''.

(تفسیر عثمانی، سورۃ التحریم:۸، بحوالہ: بینات، رمضان وشوال ۱۴۳۵ھ-اگست ۲۰۱۴ء)

(۲۰) مشہور مفسر قرآن ومفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی شفیع صاحبؒ نے لکھا ہے کہ: نصوح کو اگر مصدر نصح اور نصیحت سے لیا جائے تو اس کے معنیٰ خالص کرنے کے ہیں اور مصدر نصاحت سے مشتق قرار دیں تو اس کے معنیٰ کپڑے کو سینے اور جوڑ لگانے کے ہیں، پہلے معنیٰ کے اعتبار سے نصوح کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ وہ رِیا اور نمود سے خالص ہو، محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے ہوگا کہ اعمالِ صالحہ کا لباس جو گناہ کی وجہ سے پھٹ گیا ہے تو یہ اس کے خرق یعنی پھٹن کو جوڑنے والی ہے''۔ (معارف القرآن:۸/۶۴۸، ناشر: ادارۃ الصدیق ڈھابیل، گجرات)

مذکورہ تفاسیر کے حوالے سے ۲۰/قول نقل کیے گئے جن میں متقدمین ومتاخرین تمام کے اقوال اور صوفیاءِ کرام کی بھی تفاسیر منقول ہیں؛ مگر کسی نے بھی آیت کی تفسیر نصوح نامی شخص کی طرف منسوب کرکے ''نصوح کی توبہ'' نہ ترجمہ کیا اور نہ مذکورہ واقعہ ذکر کیا ہے، فن تفسیر میں مفسرین کے اقوال معتبر مانے جاتے ہیں نہ کہ خطباءِ کرام کے اور اگر کسی مفسر نے کوئی حدیث یا واقعہ نقل بھی کیا ہو؛ مگر مستند حوالہ نہ ہو یا خلافِ نصوص ہو تو مفسرین کی تفسیر کو بھی محدثینِ کرام کے پیمانہ پر تولا جاتا ہے۔

عقلی دلیل

عقلی دلیل سے کسی واقعہ کی صحت یا ضعف کو ثابت نہیں کیا جاسکتا؛ مگر ضعف کو سمجھا جاسکتا ہے؛ اِس لیے یہ بات ذکر کی جارہی ہے کہ اللہ رب العزت نے ایمان وعمل میں نمونہ ومعیار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ

کو بنایا ہے؛ چنانچہ ایمان سے متعلق فرمایا: ﴿اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ اعمال میں فرمایا: ﴿وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ توبہ بھی ایک عمل ہے، اگر اس میں نمونہ پیش کرنا ہوتا تو صحابۂ کرامؓ کو ہی نمونہ کے طور پر پیش کیا جاتا جیسا کہ احادیث میں بعض صحابہ بھق اور صحابیاتؓ کی توبہ کا ذکر ہے اور ''نصوح'' کسی صحابی کا نام ہوتا؛ مگر ایسا ثابت نہیں ہے، تو آیت کی تفسیر اس موضوع واقعہ پر موقوف رکھنا یا ترغیب کے لیے غیر مستند واقعہ کا سہارا لینا جب کہ توبہ سے متعلق مستند واقعات کی کثرت موجود ہے درست نہیں ہے۔

کیا نصوح کسی شخص کا نام ہے؟

بعض لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ نصوح آپ علیہ السلام کے زمانے کا ایک شخص تھا جس نے سچی توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس کی توبہ کی طرح توبہ کرنے کی ترغیب دی، کیا یہ بات درست ہے؟ یا یہ بنی اسرائیل کا کوئی شخص تھا؟

علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے ان دونوں باتوں کی تردید فرمائی ہے، فرماتے ہیں کہ بعض جاہل لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ نصوح آپ علیہ السلام کے زمانے کا شخص تھا جس کی توبہ قبول ہوئی تو یہ کہنے والا جھوٹا شخص ہے، اس شخص کو حدیث اور تفسیر کے علم کا پتہ ہی نہیں، نہ ہی اس کو لغت اور معانی کا علم ہے؛ کیونکہ اس نام کا کوئی شخص کبھی پیدا ہی نہیں ہوا اور نہ متقدمین میں اس نام کا کوئی شخص گزرا ہے، نہ ہی اس شخص کا قصہ کسی نے ذکر کیا ہے۔ ''**ومن قال من الجهال: إن "نصوح" اسم رجل كان علىٰ عهدالنبي صلّى اللّٰه عليه وسلم أمر الناس أن يتوبوا كتوبته: فهٰذا رجل مفتر كذاب جاهل بالحديث والتفسير جاهل باللغة ومعاني القرآن، فإن هٰذا امرؤ لم يخلقه اللّٰه تتعالىٰ ولا كان في المتقدمين أحد اسمه نصوح ولا ذكر هذه القصة أحد من أهل العلم**''.

علامہ ابنِ تیمیہؒ لکھتے ہیں: جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں نصوح سے مراد بنی اسرائیل کی کوئی عورت یا مرد ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں تھے، تو یہ شخص جھوٹا ہے اور اس کو توبہ کرنے کی ضرورت ہے اور اگر توبہ نہیں کرتا تو اس کو سزا دی جائے گی۔ ''**ومن قال: إن المراد بهٰذه الآية رجل أو امرأة اسمه نصوح وإن كان علىٰ عهد عيسىٰ أو غيره فإنه كاذب يجب أن يتوب من هذه فإن لم يتب وجبت عقوبته بإجماع المسلمين**''. (تفسیر کبیر، تفسیر ابنِ تیمیہ: ۸۱/۷، بحوالہ تنبیہات، سلسلہ نمبر: ۲۹۲)

حاصل یہ کہ مذکورہ آیت توبہ کے تحت میں یا بطورِ ترغیب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یا کسی صحابی کی طرف منسوب کرکے مذکورہ واقعہ بیان کرنا یا مطلقاً بھی ذکر کرنا درست نہیں ہے۔

فائدہ: توبہ دل کا نُور ہے، نفس کی پاکیزگی ہے، ''توبہ'' روح کا عمل ہے، یہ جتنی بار کی جائے روح میں نکھار پیدا ہوتا ہے، توبہ انسان کو حقیقی زندگی کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ ءزندگی کا قافلہ کوچ کر جانے اور موت آنے سے پہلے رب سے معافی مانگ لے، یہ ایک اَٹل حقیقت ہے کہ قبر محض ایک گڑھا نہیں؛ بلکہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔

صحیح توبہ کی شرائط:

(۱) فوری طور سے معصیت و گناہ سے باز آنا۔

(۲) تمام سابقہ گناہوں پر دل سے ندامت ہو، ندامت ہی توبہ کا رکنِ اعظم ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''**الندم التوبة**'' ندامت توبہ ہے۔ (مسند ابی یعلیٰ، مسند عبداللہ بن مسعودؓ، حدیث نمبر: ۴۹۶۹، ۵۰۸۱، ۵۱۲۹)

(۳) دوبارہ گناہ کا ارتکاب نہ کرنے کا پکا عزم۔ (تفسیر السراج المنیر: ۶۸/۲)

(۴) لوگوں کے حقوق کی ادائیگی یا ان سے معاف کرانا۔ (تفسیر ابنِ کثیر: ۱۶۹/۸)

امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ اگر معصیت کا تعلق آدمی سے ہو تو اس کے لیے چار شرائط ہیں، تین وہ جن کا اُوپر تذکرہ ہوا اور چوتھی یہ کہ لوگوں کے حقوق سے خود کو بَری کرے، اگر کسی کا مال یا اس طرح کی کوئی چیز لی ہے تو واپس لوٹا دے، اگر کسی پر جھوٹی تہمت وغیرہ لگائی ہے تو اس سے معافی طلب کرے یا اس کو ''حد'' پر قدرت دے اور اگر کسی کی غیبت کی ہے تو اس کی بھی معافی مانگے۔ (ریاض الصالحین: ۱۲)

(۵) بندہ اخلاص کو اختیار کرے، یعنی اللہ کے عذاب کے خوف و ڈر اور اس کی مغفرت و ثواب کی اُمید پر گناہوں کو ترک کرے۔

(۶) توبہ کا عمل ''توبہ کے وقت'' میں ہو۔ رُوِيَ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: **يَجْمَعُ التَّوْبَةَ سِتَّةُ أَشْيَاءَ: النَّدَامَةُ عَلَى الْمَاضِيْ مِنَ الذُّنُوْبِ، وَإِعَادَةُ الْفَرَائِضِ. وَرَدُّ الْمَظَالِمِ، وَاسْتِحْلَالُ الْخُصُوْمِ، وَأَنْ تُذِيْبَ نَفْسَكَ فِيْ طَاعَةِ اللّٰهِ كَمَا رَبَّيْتَهَا فِي الْمَعْصِيَةِ، وَأَنْ تُذِيْقَهَا مَرَارَةَ الطَّاعَاتِ كَمَا أَذَقْتَهَا حَلَاوَةَ الْمَعَاصِيْ، وَتَقُوْمُ مَقَامَ رَدِّ الْمَظَالِمِ اسْتِحْلَالُ الْمَظْلُوْمِ حَتّٰى يَعْفُوَ عَنْهُ**''. (أنوار التنزيل وأسرار التأويل، المعروف بتفسير البيضاوي: ۲۲۶/۵، المؤلف: ناصر الدين أبو سعيد عبد اللّٰه بن عمر بن محمد الشيرازي البيضاوي، المحقق: محمد عبدالرحمٰن المرعشلي، الناشر: دار إحياء التراث العربي، بيروت)

اصلاحِ معاشرہ (قسط اوّل)

منکراتِ رجب جدید

ازقلم: مفتی عبداللطیف صاحب قاسمی، استاذ مدرسہ عربیہ غیث الہدیٰ بنگلور

ایک عرصۂ دراز پہلے حضرت مولانا مفتی محمد جمال الدین صاحب قاسمی صدرالمدرسین وصدر مفتی دارالعلوم حیدرآباد کوایک پمفلٹ موصول ہوا، جو ماہِ رجب سے متعلق بے شمار احادیث اور اعمال پر مشتمل تھا، آپ نے احقر کو اس پمفلٹ کا جائزہ، اس کے مشتملات کی تحقیق اور جواب تیار کرنے کا حکم فرمایا؛ چنانچہ احقر نے حضرت والا کی نگرانی میں اس پمفلٹ کا تحقیقی جائزہ لیا اور جواب تیار کیا؛ نیز اس جواب کے آخر میں حضرت اقدس مولانا محمد اسلم صاحب رشادی مدظلہٗ کی تصحیح وتصویب بھی درج ہے، عماء وعوام کے لیے نہایت مفید ہونے کی وجہ سے نظر قارئین کیا جارہا ہے۔

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین مفتیانِ شرع متین اِس پمفلٹ میں مندرج روایات اور اعمال کے متعلق؟

بیّنوا توجروا۔ فقط المستفتی

الجواب وھو الموافق للصواب: پمفلٹ میں درج اکثر احادیث ضعیف، منکر اور موضوع ہیں، ان میں ذکر کردہ فضیلت کا اعتقاد رکھنا درست نہیں ہے، اس پمفلٹ میں جن اعمال کا ذکر کیا گیا ہے وہ بدعت ومکروہ ہیں، شریعت میں اس طرح کے اعمال ثابت نہیں ہیں؛ البتہ پمفلٹ میں جن دعاؤں کا ذکر ہے وہ احادیث شریفہ سے ثابت ہیں؛ لیکن ان موافق میں وارد نہیں ہوئی ہیں جن میں ان کو بیان کیا گیا ہے؛ لہٰذا بہی خواہانِ قوم، خطباء وواعظین حضرات کو چاہیے کہ اس طرح کی من گھڑت وضعیف روایات کو ممبر ومحراب اور مجالس میں ذکر کرنے سے احتراز کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک ہے:

"**من كذب عليّ متعمدا فليتبوأ مقعده من النار**". (متفق علیہ)

جو شخص جان بوجھ کر کسی جھوٹی بات کو میری طرف منسوب کرے، اس کو چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے؛ لہٰذا اپنے آپ کو وعید مذکور سے بچائیں۔

ذیل میں ہر حدیث کا درجہ محدثین کے اقوال کی روشنی میں بیان کیا جارہا ہے۔

پمفلٹ میں ایک حدیث (۱) اس طرح درج ہے:

(۱) حدیث:

رجب اللہ کا مہینہ ہے۔

حافظ ابوبکر احمد بن حسین بن علی البیہقی (المتوفی ۴۵۸ھ) کی صراحت کے مطابق درج بالا حدیث کے الفاظ اِس طرح ہیں:

عن أنس بن مالک رضي اللّٰه عنه قال، قال رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم: ''خيرة اللّٰه من الشهر شهر رجب، هو شهر اللّٰه، من عظم شهر رجب، فقد عظم أمر اللّٰه، ومن عظم أمر اللّٰه أدخله جنات النعيم، وأوجبه رضوانه الأكبر، وشعبان شهري، فمن عظم شعبان، فقد عظم أمري، ومن عظم أمري كنت له فرطا، وذخرا يوم القيامة، وشهر رمضان شهر أمتي، فمن عظم شهر رمضان، وعظم حرمته ولم ينتهكه وصام نهاره وقام ليله، وحفظ جوارحه، خرج من رمضان، وليس عليه ذنب يطلب اللّٰه''. (شعب الإيمان:۳۷۵/۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہتر مہینہ رجب کا مہینہ ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا مہینہ ہے، جس شخص نے رجب کے مہینے کی تعظیم کی اُس نے اللہ کی تعظیم کی اور جو شخص اللہ کی عظمت کو بجالائے اللہ تعالیٰ اُس کو جنت میں داخل فرماتے ہیں اور اس کے لیے اپنی رضامندی لازم قرار دیتے ہیں اور شعبان کا مہینہ میرا مہینہ ہے، جس شخص نے شعبان کی تعظیم کی گویا اس نے میری تعظیم کی اور جو شخص میری تعظیم کرے میں قیامت کے دن اس کے لیے فرط اور باعثِ ذخیرہ بنوں گا، رمضان میری امت کا مہینہ ہے، جو شخص ماہِ رمضان کی تعظیم کرے، اُس کی حرمت کو برقرار رکھے، اس مہینہ میں نامناسب اعمال سے اجتناب کرے، دن میں روزہ رکھے، رات میں قیام کرے اور اپنے اعضاء کی حفاظت کرے، تو رمضان کا مہینہ اس حال میں ختم ہوتا ہے کہ اس پر کوئی ایسا گناہ نہیں ہوگا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اُس کی گرفت فرمائیں۔

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد امام بیہقیؒ نے امام احمد بن حنبلؒ کا قول یوں نقل کیا ہے:

''هٰذا اسناد منكر بمرة روى عن أنس غير هٰذا، تركته، فقلبي نافر عن رواية المناكير التي أتوهمها، بل أعلمها موضوعة، واللّٰه يغفر لنا برحمته''. (شعب الإيمان:۳۷۵/۳)

''اس روایت کی سند منکر ہے مرہ کی وجہ سے جو کہ اس روایت کا راوی ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے دیگر روایات بھی انھوں نے بیان کی ہیں، میرا دل منکر روایتوں کو بیان کرنے سے متنفر ہے؛ بلکہ میں ان کو موضوع سمجھتا ہوں، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مغفرت فرمائے''۔

(۲) حدیث:

ماہِ رجب کی فضیلت تمام مہینوں پر ایسی ہے جیسے قرآنِ مجید کی فضیلت تمام اذکار پر۔

علامہ ابوالحسن علی بن محمد الکنانیؒ ''صاحبِ تنزیہ الشریعۃ'' مذکورہ روایت کو موضوعات کے تحت ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وقد ورد في صيام رجب، والعبادة فيه أحاديث، منها باطل ومنها ماهو ضعيف..... ومنها ماذكره أبو البركات هبة الله من مبارک مرفوعًا: فضل رجب على الشهر كفضل القرآن علىٰ سائر الأذكار. (تنزيه الشريعة:٢/١٦١)

''ماہِ رجب کے روزے اور اس میں عبادت کے متعلق کچھ احادیث وارد ہوئی ہیں جن میں سے بعض باطل اور بعض موضوع ہیں اور اسی قبیل سے وہ روایت ہے جس کو ابوالبرکات ہبۃ اللہ بن مبارک نے مرفوعاً ذکر کیا ہے: رجب کی فضیلت تمام مہینوں پر ایسی ہے جیسی قرآنِ مجید کی فضیلت تمام اذکار پر''۔

علامہ عبدالحق محدث دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں:

حافظ دیلمیؒ نے مذکورہ روایت کو موضوع کہا ہے۔(مؤمن کے ماہ وسال: ماثبت بالسنۃ:۱۷۳)

(۳) حدیث:

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

رجب بہشت میں ایک نہر کا نام ہے، جس کا پانی شہد سے زیادہ شیریں، برف سے زیادہ ٹھنڈا اور دودھ سے زیادہ سفید ہے، جو شخص اس مبارک مہینہ میں ایک روزہ بھی رکھے گا، اللہ تبارک وتعالیٰ اس شخص کو اس نہر کے پانی سے سیراب فرمائے گا۔

علامہ بیہقیؒ نے حضرت انسؓ کی سند سے اس روایت کو اِس طرح نقل کیا ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إنّ في الجنة نهرًا، يقال له رجب أشد بياضًا من اللبن، وأحلى من العسل، من صام من رجب يومًا، سقاه الله من ذٰلک النهر. (شعب الإيمان:٣/٣٦٨)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت میں ایک نہر ہے، جس کو رجب کہا جاتا ہے، اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہے، جو شخص رجب کا ایک روزہ بھی رکھے گا اللہ تعالیٰ اُس شخص کو اس نہر سے سیراب فرمائیں گے''۔

علامہ بیہقیؒ نے اس مضمون کی مزید دیگر روایات بیان کرنے کے بعد ان پر درج ذیل الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

"وقد ورد في هٰذا الباب أحاديث مناكير، في روايتها قوم مجهولون وضعفاء، وأنا أبرء إلى اللّٰه تعالٰى من عهدتها، فهٰهنا قد تقدم بعضها ومنها.....". (شعب الإيمان:٣٦٩/٣)

''ماہِ رجب کے فضائل میں منکر روایتیں مروی ہیں جن کو غیر معروف اور ضعیف حضرات نے بیان کیا ہے، میں اللہ تعالیٰ کے سامنے ان روایات کی ذمہ داری سے براءت کا اظہار کرتا ہوں، جن میں بعض روایتیں گزر گئیں، بعض آگے آئیں گی''۔

علامہ محقق ابوعبداللہ شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان الذہبیؒ الدمشقی (المتوفی ۸۴۸ھ) اس حدیث کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"هٰذا باطل". (لسان الميزان:١٨٩/٤)

نیز صاحب ''المنہل المورود شرح سنن ابی داؤد'' کی رائے بھی علامہ بیہقیؒ کی طرح ہے۔ (المنہل:۱۰/۱۸۷)

(۴) حدیث:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ماہِ رجب کا چاند ملاحظہ فرماتے تو دونوں دستِ مبارک اُٹھا کر یہ دعا پڑھتے تھے:

"اللّٰهم بارك لنا في رجب وشعبان، بلّغنا شهر رمضان".

علامہ بیہقیؒ کے الفاظ میں روایتِ بالا یوں ہے:

"أخبرنا أبوعبداللّٰه الحافظ..... القواريري نازياد المنيري عن أنس قال قال كان النبي صلّى اللّٰه عليه وسلم إذا دخل رجب: قال اَللّٰهم بارك لنا في رجب وشعبان وبلّغنا رمضان". (شعب الإيمان:٣٧٥/٣)

''زائدہ بن ابی رقاد زیاد نمیری سے روایت کرتے ہیں، وہ حضرت انسؓ سے اور انسؓ فرماتے ہیں: جب رجب کا مہینہ آجاتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ سلم یوں دعا فرماتے تھے: **"اللّٰهم بارك لنا في رجب وشعبان وبلّغنا رمضان"**۔

امام بیہقیؒ اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد اس پر یوں کلام فرماتے ہیں:

"تفرد به زياد المنيري وعنه زائدة ابن أبي رقاد، قال البخاري: زائدة ابن أبي رقاد عن زياد المنيري، منكر الحديث". (شعب الإيمان للبقيهقي:٣٧٥/٣)

’’زیاد نمیری اس حدیث کی روایت نقل کرنے میں منفرد ہیں اوران کے شاگرد زائدہ بن ابی رقاد جواپنے استاذ زیاد نمیری سے حدیث نقل کرتے ہیں ان کے بارے میں امیرالمؤمنین فی الحدیث محمد بن اسماعیل بخاریؒ فرماتے ہیں: یہ منکرالحدیث ہے‘‘۔

علامہ نوویؒ نے اسی روایت کو’حلیۃ الاولیاء‘ ‘اور’’عمل الیوم واللیلۃ، لابن السنی‘‘ سےنقل کرنے کے بعد لکھاہے:

’’رويناه في ’’حلية ال.ولياء‘‘ باسناد فيه ضعف عن زياد المنيري عن أنس رضي اللّٰه عنه الخ‘‘. (كتاب الأذكار: ١٧١)

’’مذکورہ روایت کوہم نے’’حلیۃ الاولیاء‘‘ سے بیان کیاہے، ایسی سند کے ساتھ جوضعیف ہےیعنی زیاد نمیری ضعیف ہے‘‘۔

(۵) حدیث:

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا:

اے سلمان! نہیں کوئی بندۂ مومن اورمومنہ کہ پڑھےاس میں بیس رکعت نفل، تو معاف کرے گا اللہ تبارک وتعالیٰ تمام گناہ قیامت کے دن، اُٹھایا جائے گا شہیدوں کیساتھ اوراس کا نام عابدوں یعنی عبادت گزاروں میں لکھاجائے گا اورثواب ایک سال کی عبادت کا لکھا جائے گا اورحرام کرے گا اللہ تعالیٰ دوزخ کی آگ کواورفرمایا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کوخبردی اس نماز کے ثواب کی جبرئیل نے، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نےعرض کیا یارسول اللہ! اس نماز کوکس طرح پڑھوں؟ توحضورصلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پڑھ رجب کی پہلی رات کودس رکعت نفل پانچ سلام سے، پندرہویں اورآخری رات کوبھی اور پڑھ ہررکعت میں بعدالحمد کے سورۂ کافرون اورسورۂ اخلاص تین بار ہرسہ روز بعدنماز فراغت تین بارکلمۂ توحید پڑھ کر پہلی رات یہ دعاپڑھے:

اللّٰهم لامانع لما أعطيت ولا معطي لما منعت ولاينفع ذا الجدّ منك الجد

پندرہویں رات یہ پڑھے:

الٰها واحدا أحداً وصمداً، وفرداً ووتراً، لم يتّخذ صاحبة ولاولدًا،

آخری رات یہ دعاپڑھے:

اللّٰهم صلّ علٰى سيّدنا محمد وآله الطاهرين ولاحول ولاقوة إلا باللّٰه العظيم.

اس کے بعد مانگ تو اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجتوں کو، قبول فرمائے گا اللہ تعالیٰ دعا تیری اور دن قیامت کے تیرے اور دوزخ کے درمیان ستر خندق کا فاصلہ ہوگا، ہر خندق کی چوڑائی پانچ سو برس کی راہ ہوگی اور عطا کرے گا اللہ تعالیٰ ثواب ہر رکعت کے بدلے ہزار رکعت کا، جب سنی یہ حدیث حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے، تو اُٹھے اور خدا کا شکر بجالائے اتنے بڑے انعام پر، پھر کبھی سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے اس نماز کو نہیں چھوڑا۔

یہ حدیث الفاظ کے الفاظ تھوڑے فرق کے ساتھ ابوالحسن علی بن محمد الکنانیؒ نے ذکر کی ہے؛ مگر اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد ابنِ جوزیؒ کا قول بلا کسی تبصرہ سے یوں نقل کیا ہے:

وفي سنده مجاهيل. (تنزيه الشريعة المرفوعة عن الأحاديث الشنيعة الموضوعة:۸۹/۲)

اس کی سند میں مجہول اور غیر معروف راوی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابنِ جوزیؒ کی بات صاحبِ تنزیہ الشریعۃ کے نزدیک بھی صحیح ہے؛ اِس لیے اس روایت پر بھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

(جاری.....)

❑❖❑